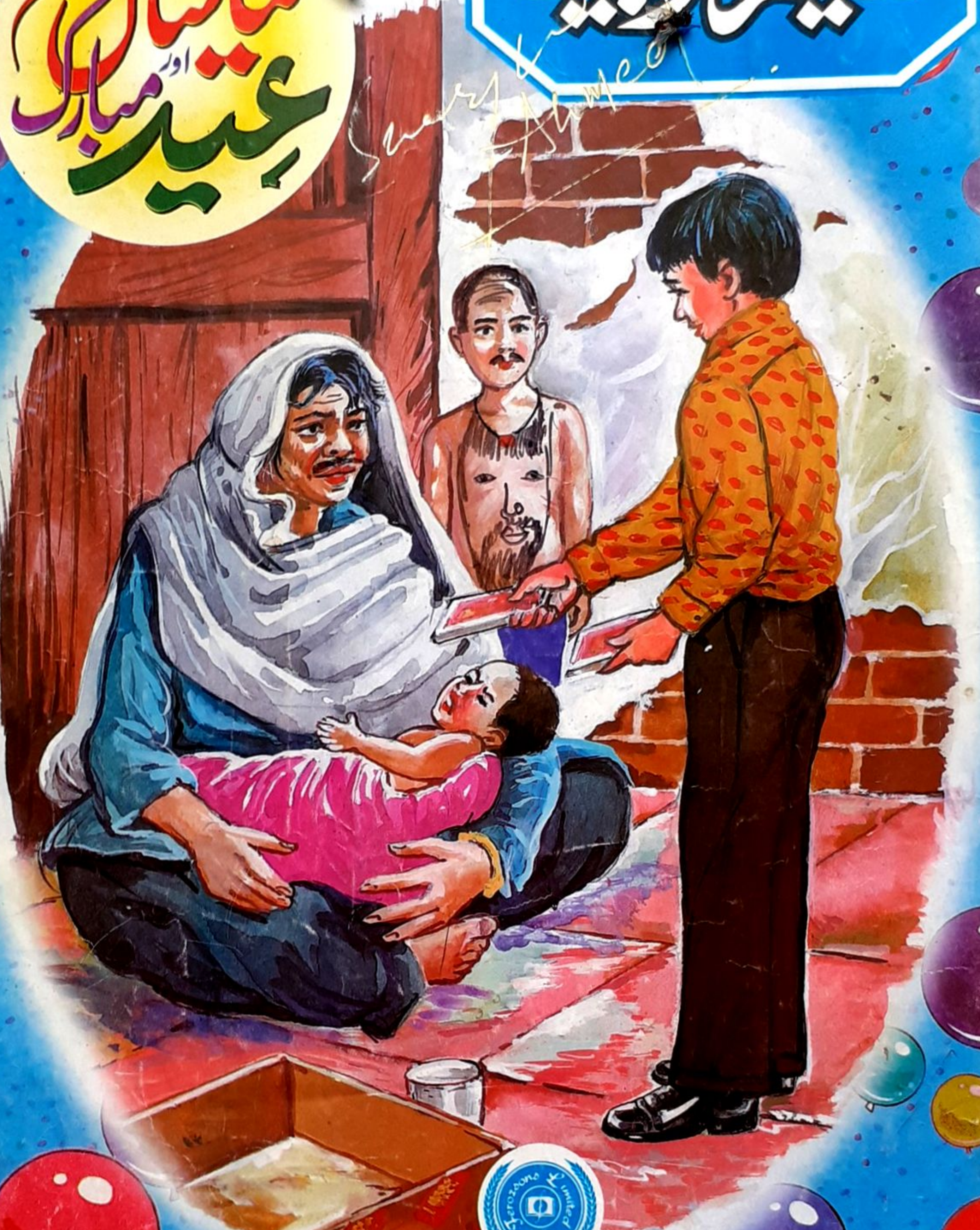
تعلیم و تربیت

نیا سال اور عید مبارک



جنوری 2001ء

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

60واں سال
دسواں شمارہ

بچوں کا محبوب رسالہ

سرکولیشن اسسٹنٹ	اسٹریٹنگز/ڈیزائننگ	خصوصی مشیر	سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر	ایڈیٹر/پبلشر	چیف ایڈیٹر
محمد بشیر راہی	سید شوکت اعجاز	محمود حسن رومی	ڈاکٹر رضوان ثاقب	سعید لخت	ظہیر سلام	عبدالسلام



سچ مچ کے چور

"میں آگے آگے تھا اور وہ پیچھے پیچھے...... اتنا تیز میں کبھی نہیں دوڑا تھا۔ جب کہ وہ تو اس کا عادی تھا...... میں کئی گلیاں عبور کر آیا اور دھڑام سے کسی چیز سے ٹکرا کر اس پر جا پڑا...... اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبوچ لیا اور گرجا "کیا ہو تم؟ کدھر پھرتے ہو؟...... مم...... مجھے چھوڑ دیں میں آئندہ کسی سے نہیں ٹکراؤں گا اور کم از کم آپ سے تو ہرگز نہیں ٹکراؤں گا"۔

طنز و مزاح سے بھرپور محمد ادریس قریشی کا بہترین شاہکار...... آئندہ ماہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

السلام علیکم و رحمتہ اللہ!

دسمبر کی 27 یا 28 تاریخ کو عید الفطر کا خوشیوں بھرا تہوار آ رہا ہے۔ ہماری طرف سے دلی مبارک باد۔ خدا کرے آپ کو ایسی خوشیوں بھری ان گنت عیدیں دیکھنی نصیب ہوں (آمین)۔ لیجیے ہم نے نئے سال جنوری 2001ء کا شمارہ بھی دسمبر میں بلکہ عید سے بھی پہلے آپ تک پہنچا دیا ہے۔ اب عید پر آپ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو اپنے محبوب رسالے کے بالکل نئے شمارے کا تحفہ دے سکیں گے۔ اس دفعہ ہم نے یہ شمارہ عید کے موقع پر خاص محنت کے ساتھ تیار کیا ہے۔ اس لیے ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے دوستوں اور عزیزوں کو یہ تحفہ بہت پسند آئے گا۔

بہت سارے ساتھیوں نے ہمیں عید مبارک اور نیا عیسوی سال مبارک کے خوب صورت کارڈ بھیجے ہیں۔ ان ڈھیر سارے کارڈوں کا فرداً فرداً جواب دینا تو ہمارے لیے ممکن نہیں بہر حال ان سب ساتھیوں کی ہم بہت قدر کرتے ہیں کہ انہوں نے خوشی کے ان مواقع پر تعلیم و تربیت کے اسٹاف کو اپنے پر خلوص عید کارڈوں کی صورت میں یاد رکھا۔ اگر کوئی اچھا کام کرے تو ہمیں اس کی دل کھول کر تعریف کرنی چاہیے کیوں کہ سچی تعریف سے انسان کا حوصلہ بڑھتا ہے اور وہ پہلے سے بھی بہتر کام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا پورا اسٹاف ہر ماہ اچھے سے اچھا شمارہ تیار کرنے کے لیے دن رات ایک کیے رہتا ہے۔ اس ان تھک محنت کے دوران میں جب آپ کی طرف سے کوئی تعریف کا کلمہ سننے کو ملتا ہے تو ہمارا حوصلہ بہت بڑھ جاتا ہے اور ہمارے اندر ایک نیا جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ ایڈیٹر

جنوری
2001ء
قیمت فی پرچہ 15 روپے
(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

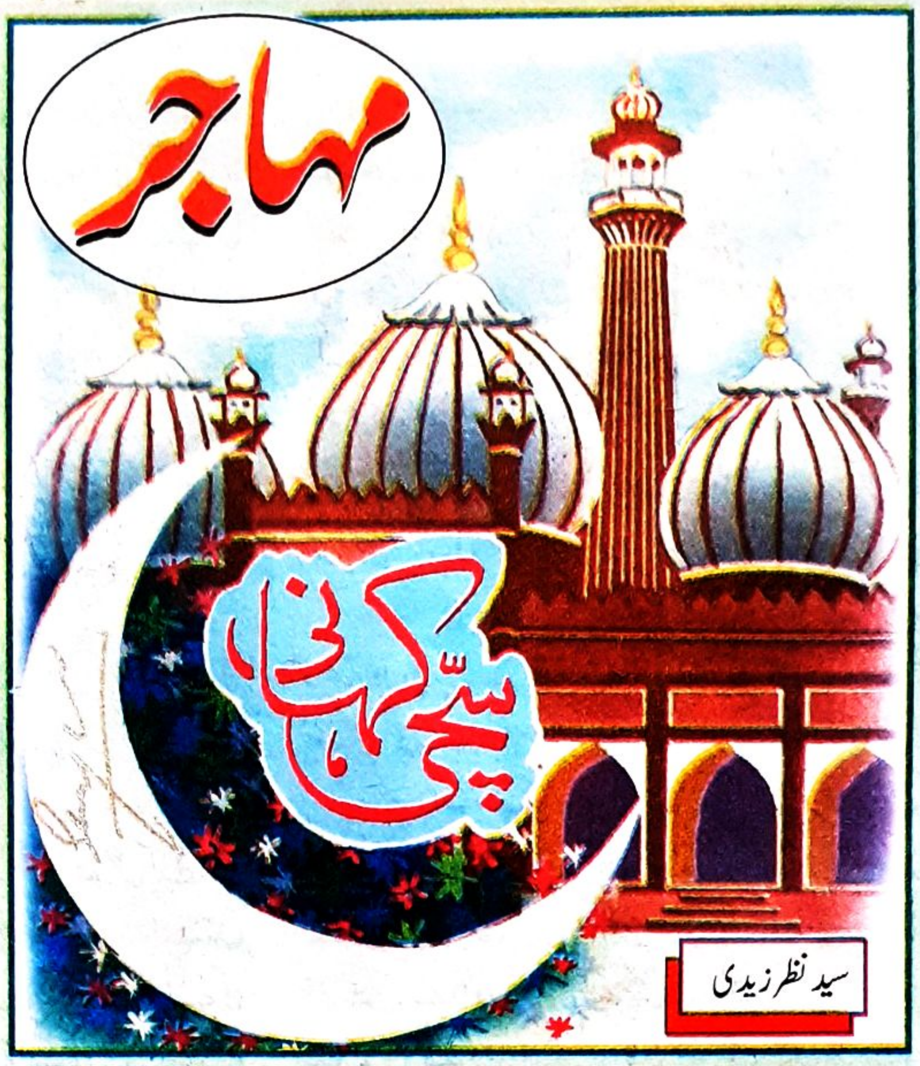
پرنٹر: عبدالسلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

سرورق: خوشیاں آدھی آدھی

اس شمارے میں

سالانہ قیمت پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے
مشرق وسطیٰ افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =/690 روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =/770 روپے
امریکا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) =/890 روپے

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس، لاہور
فون: 6278815 - 6278816 - 6361309 - 6361310



سفر بہت مشکل سے کٹا تھا، لیکن مرزا صاحب خیر خیریت سے کراچی پہنچ گئے تھے۔ اس زمانے میں مہاجرین کے قافلے دو راستوں سے پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک راستہ واہگہ اور دوسرا کھوکھراپار تھا۔ کچھ اور راستے بھی تھے لیکن زیادہ مہاجر انہی راستوں سے آتے تھے۔

یہ 14 اگست 1947ء کے بعد کا زمانہ تھا۔ بھارت اور پاکستان کے نام سے دو آزاد ملک بن گئے تھے اور دونوں ملکوں کی حکومتوں نے صلاح مشورے سے طے کیا تھا کہ جو غیر مسلم پاکستان سے بھارت جانا چاہیں خوشی سے چلے جائیں اور جو مسلمان بھارت سے پاکستان آنا چاہیں آجائیں۔ اسے تبادلہ آبادی کا معاہدہ کہا گیا تھا۔ اگر اس پر ایمان داری سے عمل ہوتا تو نہ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو کسی قسم کی تکلیف ہوتی نہ بھارت جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کو، لیکن بھارت نے اس معاہدے پر عمل نہ کیا۔ مسلمان مہاجرین کے قافلوں اور ٹرینوں پر حملے شروع کر دیئے اور انہیں بہت نقصان پہنچایا۔

یہ خاندان بھی بہت نقصان اٹھا کر اور تکلیفیں سہ کر کراچی پہنچا تھا۔ یہاں کچھ رضا کار اور درد دل رکھنے والے سندھی مسلمان مہاجرین کو نئے سرے سے آباد کرنے کا کام کر رہے تھے۔ رضا کاروں کا ایک دستہ اس خاندان کی امداد کے لیے بھی آگیا۔ نوجوان رضا کاروں نے پاکستان پہنچنے پر انہیں مبارک باد دی۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا اور بھارت چلے جانے والے کسی ہندو کا خالی گھران کے سپرد کر کے کہا "لیجئے حضرت، آپ اس گھر میں اطمینان سے رہیے ان شاء اللہ جلد ہی یہ آپ کے نام الاٹ کرا کے کاغذات آپ کو دے دیئے جائیں گے۔ یہاں سے آپ کو کوئی نہ نکالے گا۔ سمجھئے یہ آپ کا ہوا"۔

رضا کار تسلی تشفی دے کر چلے گئے تو اس گھر کے نئے مالک نے اس کا جائزہ لیا۔ انہیں اندازہ ہوا کہ کوئی غریب آدمی ہی اس میں رہتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دو کمرے جن کا دیواروں کا پلستر اکھڑا ہوا اور دروازوں کی چولیں ہلی ہوئی تھیں، اس کے پہلے مالک کی غربت کی کہانی سنا رہے تھے اور اس سے بھی بڑا ثبوت اس کی معمولی حیثیت کا یہ تھا کہ اس میں سامان نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں، جانے والے جھاڑو کے تنکے تک سمیٹ کر ساتھ لے گئے تھے۔

مہاجروں کے اس خاندان میں کل پانچ افراد تھے۔ ایک مرزا صاحب، ایک ان کی بیوی اور تین بچے۔ مرزا صاحب لباس اور شکل صورت سے پڑھے لکھے اور بہت سمجھ دار لگتے تھے۔ انہوں نے بیوی کی طرف دیکھ کر خوش دلی کے انداز میں کہا۔

"لو بیگم، اللہ پاک نے ہماری ایک مشکل تو آسان کر دی۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اپنے نئے وطن میں پہنچ کر رہیں گے کہاں، سو خدا کا شکر ہے مکان تو ہمیں آسانی سے مل گیا"۔

"آپ اسے مکان کہ رہے ہیں۔ محل کیوں نہیں کہتے" بیگم نے بہت خفا ہو کر کہا۔ "دلی میں آٹھ کمروں کی شان دار حویلی چھوڑ کر آئی ہوں میں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کس حکیم نے مشورہ دیا تھا آپ کو کہ اپنے بزرگوں کا وطن چھوڑ کر پاکستان تشریف لائیں"۔

مرزا صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی بیگم، تم تو بہت ناراض لگ رہی ہو، ہمارا تو خیال تھا پاکستان پہنچ کر شکر کا سجدہ ادا کرو گی!"

"کیا اس بات کا شکر ادا کروں کہ محل سے نکل کر قبر میں آ گئی ہوں، میرا تو دم گھٹا جا رہا ہے اس گھر کو دیکھ کر۔ راستے میں جو تکلیفیں اٹھائیں ان کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں"۔ بات ختم کر کے بیگم نے بہت غصے سے اپنے مرزا صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔



مرزا صاحب کچھ دیر خاموش رہے۔ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر سمجھانے کے انداز میں بولے "بیگم، سامنے نظر آنے والے نقصان اور درد بن کر بے چین کرنے والی تکلیفوں کو کون جھٹلا سکتا ہے۔ بے شک بظاہر ہمارا نقصان ہوا ہے اور راستے میں ہم نے بہت دکھ جھیلے ہیں لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اس نقصان اور ان تکلیفوں کا اجر کتنا عظیم ہے؟"

"دیکھ تو رہی ہوں آنکھوں سے وہ اجر۔ اس قبر نما مکان میں جھلنگا چارپائی بھی نہیں جس پر میرے بچے بیٹھ جائیں"۔

بیگم کی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو اب اس کے رخساروں پر بہ رہے تھے اور رنج اور غصے سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

مرزا صاحب ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے قریب ہو گئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "بیگم، میں نے اس اجر کی بات نہیں کی بلکہ اس اجر کی بات کی ہے جو اللہ ہجرت کرنے والوں کو آخرت میں دے گا اور یقین کرو وہ ایسا ہے کہ ہم جیسے دنیا والے اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ وہ رب رحیم اپنے نیک بندوں کو جنت کے باغوں میں داخل کرے گا اور بے شمار انعاموں سے نوازے گا۔ بیگم، ہجرت پاک رسول ﷺ کی سنت ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپؐ اپنا آبائی شہر مکہ چھوڑ کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے اور آپؐ کے ساتھ آپؐ کے صحابہ نے بھی ہجرت کی تھی؟"

"خدا کے فضل سے مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہے کہ مدینہ کے انصار نے مہاجروں کو اس طرح خوش آمدید کہا تھا کہ سگے رشتے داروں کی بھی ایسی خدمت اور مدد نہیں کی جاتی۔ خود رسول ﷺ کو حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے اپنے مکان کے سب سے اچھے حصے میں ٹھہرایا تھا۔ ادھر ہم ہیں کہ لاوارثوں کی طرح پڑے ہیں" بیگم نے کہا۔

وہ ذرا دیر رک کر کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور مرزا صاحب تیز قدم اٹھاتے ہوئے باہر آ گئے۔ ایک شریف صورت ادھیڑ عمر شخص ان کا منتظر تھا۔ اس نے



بہت اخلاق سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر السلام علیکم کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر بات شروع کر دی "میں آپ کا ہمسایہ ہوں۔ دو گھر چھوڑ کر میرا گھر ہے۔ اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ اگر کوئی دشواری محسوس کر رہے ہوں تو آپ کی مدد کروں۔ آپ آج ہی اس گھر میں آئے ہیں نا؟"

"جی آج نہیں، بلکہ ابھی ذرا دیر پہلے، رہیں دشواریاں اور پریشانیاں تو فی الحال تو یہی سامنے ہیں۔ دلی سے کچھ نہ کچھ سامان سفر لے کر چلے تھے لیکن راستے میں لٹ گئے اور اب ہم ہیں اور یہ خالی گھر" مرزا صاحب نے خوش دلی کے انداز میں کہا۔

نو وارد بولا "امیر آدمی تو میں بھی نہیں ہوں۔ کلرکی کرتے ہوئے زندگی گزاری۔ اب یہاں گھر کا خرچہ پورا کرنے کے لیے پرانے کوٹ خرید کر ان کی مرمت کرتا ہوں اور بازار میں فروخت کر دیتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے گزارا ہو رہا ہے۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیے۔ اللہ چاہے گا تو مدد کروں گا۔ ہاں میں بھی کیسا احمق ہوں، اپنی رام کہانی شروع کر دی، نہ اپنا نام بتایا نہ آپ کا اسم گرامی پوچھا اور نہ یہ معلوم کیا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ بہرحال اب عرض کرتا ہوں۔ میرا نام محمود احمد الہ آبادی ہے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے ہجرت کر کے کراچی آیا ہوں"۔

"اور میرا نام محمد ایوب ہے۔ ایکسائز آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوا ہوں اور دلی سے ہجرت کر کے اپنے نئے وطن پاکستان آگیا ہوں" مرزا صاحب نے اپنا تعارف کرایا۔

اس تعارف کے بعد دونوں نے بہت خوش ہو کر ہاتھ ملایا۔ پھر محمود احمد نے کہا "اچھا اب تکلف کے بغیر یہ بتائیں کہ آپ کی خاص ضرورت کیا ہے؟ کھانا تو آج کا بھی اور کل کا بھی ان شاءاللہ میرے گھر سے آجائے گا"۔

مرزا صاحب کچھ دیر سوچتے رہے۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر پا رہے تھے کہ اپنی ضرورت بیان کریں یا نہ کریں۔ پھر رک رک کر بولے۔ "میری خاص ضرورت تو اس وقت یہ ہے کہ سونے اور اٹھنے بیٹھنے کے لیے دو تین چارپائیاں مل جائیں۔ کھانے پینے کا انتظام تو ہم خود بھی کر لیں گے۔ لٹنے کے باوجود کچھ رقم ہمارے پاس ہے لیکن چارپائیوں کا انتظام ہمت سے باہر نظر آرہا ہے۔ رضاکار ایسے گھر میں بٹھا گئے ہیں جو دھلے ہوئے برتن کی طرح صاف ہے۔ لگتا ہے اس کا مالک تنکے تک سمیٹ کے اپنے ساتھ لے گیا ہے"۔

محمود احمد یہ بات سن کر کچھ دیر سوچتے رہے۔ جیسے یہ کام ان کی ہمت سے زیادہ ہو لیکن پھر خوش ہو کر بولے "آپ فکر نہ کیجیے چارپائیاں ابھی پہنچائے دیتا ہوں۔ کیا تین کافی ہوں گی؟"

"جی بالکل کافی ہوں گی۔ تین ہمارے بچے ہیں اور دو ہم میاں بیوی، ان شاءاللہ گزارا ہو جائے گا" مرزا صاحب نے کہا۔

اس گفت گو کے بعد محمود احمد اپنے گھر چلے گئے اور ذرا دیر بعد ہی تین چارپائیاں نئے مہاجر کے گھر پہنچا دیں۔ کھانے کا وقت ہوا تو پانچ آدمیوں کا کھانا بھی لے کر آگئے اور روزی روزگار کے سلسلے میں بھی مفید مشورے دیئے۔

آدمی کی نیت اچھی ہو تو اللہ غیب سے مدد کرتا ہے۔ دلی سے ہجرت کر کے کراچی آنے والے محمد ایوب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ معمولی کوشش سے چند دنوں ہی میں روزی کمانے کے قابل ہو گئے۔ اس زمانے میں مہاجرین کے لیے یہ بات بالکل آسان تھی کہ جھوٹا سچا کلیم داخل کر کے بڑی جائیداد کے

مالک بن جائیں۔ ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکان' دکانیں' کوٹھیاں اور زمین خالی پڑی تھی۔ سرکاری افسران کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرتے تھے اور معمولی تحقیق کر کے ان کے کلیم منظور کر لیتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس طرف دھیان نہ دیا۔ عہد نبویؐ کے مہاجرین کا طریقہ اپنایا اور خدا نے ان کی کوششوں میں اتنی برکت ڈال دی کہ تھوڑے سے دنوں ہی میں اس قابل ہوگئے کہ ضرورت کی چیزیں بھی خرید سکیں۔ چناں چہ انہوں نے سب سے پہلے چارپائیاں خریدیں اور اپنے محسن محمود احمد صاحب کے گھر جا کر ان سے کہا۔ "بھائی صاحب' خدا نے مہربانی فرمائی۔ میں اپنی ضرورت کے مطابق چارپائیاں بازار سے لے آیا ہوں لہٰذا آپ کی چارپائیاں لوٹانا چاہتا ہوں"۔

جس وقت محمد ایوب یہ کہہ رہے تھے محمود احمد کا پوتا ان کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے چارپائیاں لوٹانے کی بات سنی تو خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہوئے بولا "آہاجی' اب ہم پھر چارپائی پر سویا کریں گے۔ آہاجی"۔



محمد ایوب بچے کی یہ بات سن کر سناٹے میں آگئے۔ انہوں نے بہت حیران ہو کر محمود احمد سے پوچھا۔ "بھائی صاحب' یہ بچہ کیا کہہ رہا ہے؟ کیا آپ نے اپنی ضرورت کی چارپائیاں ہمیں دے دی تھیں اور آپ کے بچے زمین پر سو رہے تھے؟"

محمود احمد ہنستے ہوئے بولے۔ "چھوڑیئے اس بات کو' اگر میرے بچے کچھ دن زمین پر سوتے رہے تو کیا ہوا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ مجھ سے زیادہ آپ کو چارپائیوں کی ضرورت ہے۔ آپ کے بال بچے تو ننگی زمین پر بیٹھے تھے۔ اس لیے میں نے چارپائیاں آپ کو دے دیں"۔

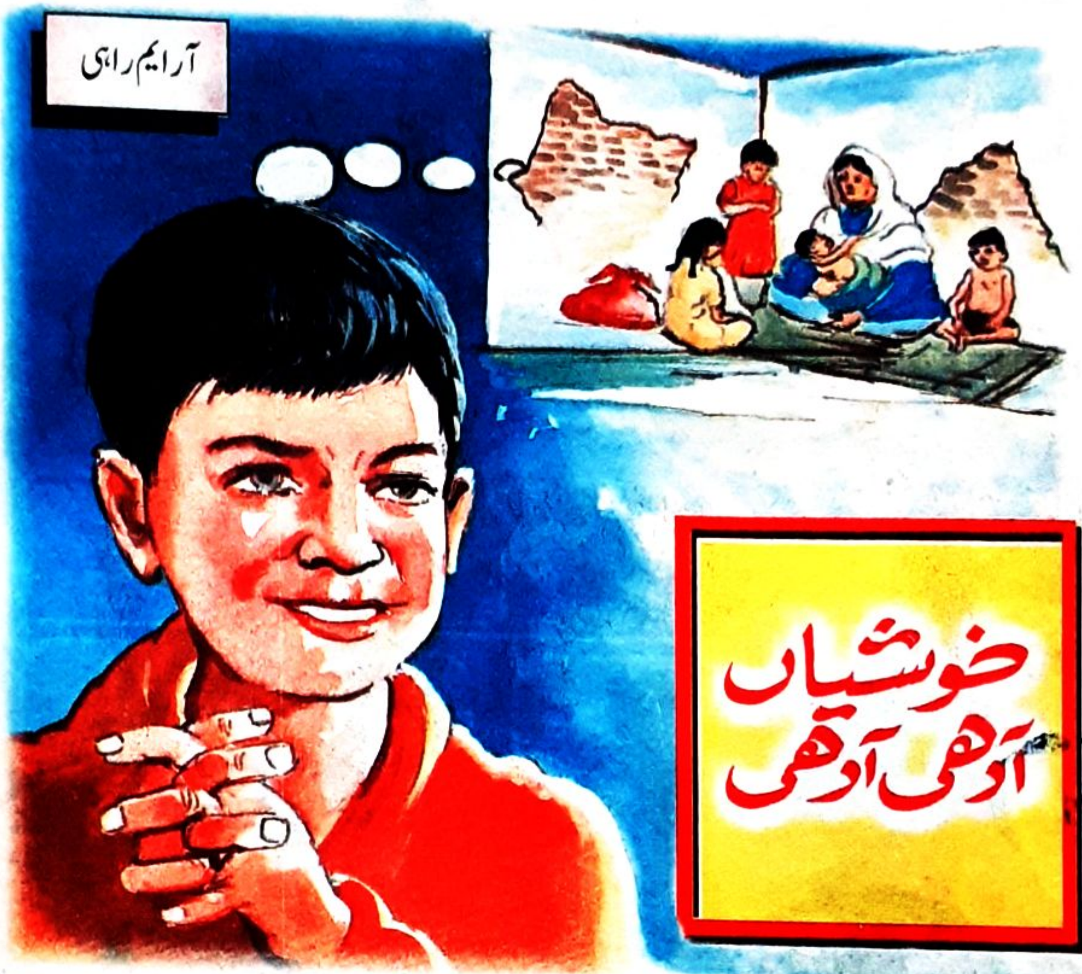
"میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں بھائی صاحب' آپ نے تو مدینہ کے انصار کی یاد تازہ کر دی جنھوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے گھروں کا آدھا آدھا سامان دے دیا تھا۔ اللہ پاک آپ کے اس ایثار کو قبول فرمائے اور اس دنیا میں بھی اس کا اجر دے"۔

محمود احمد بے پروائی سے بولے۔ "چھوڑیئے اس ذکر کو بھائی جی' میں نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دیا ہے کہ میرا ذکر ان بزرگوں کے ساتھ کیا جائے۔ دعا مانگنی ہے تو یہ مانگئے کہ اللہ ہم سب کو ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے اور وہ مقاصد پورے ہوں جن کے لیے پاکستان بنایا گیا ہے۔ میں یہ بات پورے یقین سے کہتا ہوں کہ اگر ہم اپنے بزرگوں کی طرح پکے سچے مسلمان بن گئے تو جس طرح انہوں نے دس سال کے مختصر عرصے میں اپنے سب دشمنوں کو شکست دے دی تھی اور روم اور ایران جیسی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بن گئے تھے ہم بھی ایک عظیم قوت بن جائیں گے۔ ہمارا پاکستان ایک ایسا ملک بن جائے گا کہ کوئی اس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہ کر سکے گا"۔

"ان شاء اللہ' ان شاء اللہ" محمد ایوب نے یقین بھری آواز میں کہا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ محمود احمد نے بھی ان کا ساتھ دیا اور وہ دونوں مسلمانوں اور اپنے نئے وطن پاکستان کی ترقی کے لیے دعا میں مصروف ہوگئے۔

خوشیاں آدھی آدھی

آر ایم راہی



نئے سال اور عید کی خوشیوں نے دل کی دھڑکنوں کو ایک نیا ولولہ دے دیا تھا لیکن عمر کا ننھا سا دل نہ جانے کس چیز کا خواہش مند تھا۔ وہ اس ساری ہلچل سے متاثر ہونے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کئی دن پہلے عید کے لیے اپنی ساری تیاریاں مکمل کر لیتا تھا لیکن اس بار اچانک اس کی طبیعت میں یہ تبدیلی نہ جانے کیسے آئی۔

اس دن صبح کا ناشتا کرتے وقت بھی وہ سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے تب پتا چلا جب اس کی امی نے اس کے بالوں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے بیٹا؟“

”ہوں...... کچھ نہیں...... کچھ نہیں!“ وہ چونک اٹھا۔

”میں تمہیں چند دنوں سے پریشان دیکھ رہی ہوں، تم نے ابھی تک عید کی تیاری بھی نہیں کی جب کہ عید میں صرف دو دن باقی ہیں“ اس کی امی شفقت بھرے لہجے میں بولیں۔

”ہاں بس امی جان...... ابھی تک اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوا“۔

”کیوں بیٹا! کیا امی جان کو اپنی پریشانی نہیں بتاؤ گے؟“

”پریشانی!“ وہ بولا۔ جیسے خواب میں بول رہا ہو، پھر چونک اٹھا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں امی جان!“

”اچھا، تو پھر آج رات تمہارے ماموں جان آرہے ہیں۔ ان کے ساتھ بازار جا کر عید کے لیے ساری خریداری کر لینا ٹھیک ہے نا؟“

”جی...... جی امی جان!“ اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

رات کو وہ ماموں جان کے ساتھ بازار چلا آیا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر دکانیں اور ان کے سامنے ریڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، وہ ہر دفعہ عید کے دنوں میں بازار کی رونق دیکھتا آرہا تھا۔ شور اتنا تھا کہ ہر ایک چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔ ریڑھیوں میں نصب چیختے چنگاڑتے ڈیک کان پڑی آواز سنائی نہیں دینے دیتے تھے۔

ماموں جان نے خلاف معمول اسے خاموش دیکھا تو ان سے رہا نہ گیا اور پوچھا۔ ”کیوں عمر! اتنی گہما گہمی ہے اور تم خاموش ہو؟“

عمران کی بات سن کر چونک گیا۔ ”ماموں جان! یہ شور مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا“۔

ماموں جان پریشان ہو کر بولے۔ ”کیوں بیٹا! طبیعت ٹھیک تو ہے؟“

"ٹھیک ہوں ماموں جان! لیکن!"

"لیکن کیا؟" ماموں جان حیران ہوئے۔

"آپ کو یاد ہے نا ماموں جان!" عمر نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ ذکر کیا کرتے تھے کہ نیا سال نئی تبدیلیوں کے ساتھ نمودار ہوگا"۔

"ہاں......ہاں پھر؟" ان کی حیرت بڑھ گئی۔

"تو پھر وہ تبدیلی کہاں ہے......؟"

ماموں جان اس کے بدلے ہوئے رویے پر چونکے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ عمر کیا کہنا چاہ رہا ہے لیکن اس سوال کا بھلا ان کے پاس کیا جواب تھا؟ ہر نئے سال کی آمد پر ایسی ہی تبدیلیوں کا غلغلہ ہوا کرتا تھا لیکن بدلتا کچھ نہیں تھا۔

"ماموں جان دیکھیے نا، کتنے فحش گانے لگے ہوئے ہیں، پچھلے سال بھی تو یہی کچھ تھا"۔

عمر کی آواز پر وہ خیالوں سے چونکے۔ "ہاں......ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو لیکن ان باتوں کو زیادہ مت سوچا کرو"۔

"لیکن کیوں ماموں جان! کیا تبدیلیاں صرف زبانی ہوا کرتی ہیں؟" عمر کے لہجے کا دکھ گہرا ہو رہا تھا اور ماموں جان کے پاس اسے مطمئن کرنے کے لیے کوئی تدبیر نہیں تھی۔

"شاید!" ماموں جان اس سے جان چھڑاتے ہوئے بولے اور پھر ایک دکان کے اندر داخل ہوئے۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک خوب صورت سوٹ عید کے لیے منتخب کیا اور پھر ماموں جان کے ہم راہ دکان سے نکل کر چپل مارکیٹ کی طرف بڑھا۔ چند چھوٹی چھوٹی اور تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے عمر ایک دم رک گیا۔ ماموں جان جو کہ چند قدم اس سے آگے تھے پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

عمر کی نگاہوں میں ایک اور ہی منظر اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ چھے سات سال کا ننگ دھڑنگ بچہ گھر کے کھلے دروازے کے باہر بیٹھا نہ جانے کس بات پر رو رہا تھا۔ اس کی پیٹھ کی طرف دروازے میں میلا پھٹا پرانا پردہ لٹک رہا تھا۔ ہوا پردے کو بار بار اڑا رہی تھی۔ اندر چھوٹے سے گھر کے سیمنٹ کے فرش پر ایک عورت پاؤں پھیلائے بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں شیر خوار بچہ چیخ رہا تھا اور وہ اسے چپ کرانے کے لیے پچکار رہی تھی لیکن اس کا رونا بند نہیں ہو رہا تھا۔

تنگ گلی میں ایک اور شخص کو آتے دیکھ کر عمر نے سمٹ کر اسے گزرنے کے لیے راستہ دے دیا۔ اس شخص نے قریب سے گزرتے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا دے کر کوئی چیز پھینکی۔ اس کے گزرتے ہی عمر بچے کو زمین پر پڑی ہوئی کسی چیز پر جھپٹا مارتے دیکھ کر چونکا۔ اس کی نظریں اس شے پر رک گئیں۔ اسے یک لخت ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر دبا دیا ہو۔ دکھ کی ایک لہر اس کے وجود میں سرایت کر گئی۔ گلی سے گزرتے ہوئے شخص نے کھایا ہوا سیب پھینکا تھا اور بچہ اس سیب پر نہایت بے صبری سے جھپٹا تھا۔ اس نے رونا دھونا بھی بند کر دیا تھا اور اب سیب کے بچے ہوئے حصے کو بڑی تیزی سے نوچ رہا



تھا۔

یکایک اسے جھٹکا سا لگا۔ ماموں جان اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔ ”کہاں کھو گئے ہو بیٹا! یوں راستے میں کھڑے ہونا اچھی بات نہیں“۔

اس نے جلدی سے ماموں جان کی طرف دیکھا۔ ”میں...... میں اس منظر میں کوئی نئی بات تلاش کر رہا تھا...... سال بھی تو نیا ہے نا...... کیا عید کی خوشیاں ان کے مقدر میں نہیں؟“

”اف بیٹا! میں نے کہا نا ایسی باتیں مت سوچو، تمہیں سوائے دکھ کے اور کچھ نہیں ملے گا“ ماموں جان جھلا کر بولے اور عمر حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ جوتوں کی دکان پر کھڑے جوتے پسند کر رہے تھے۔ اس کی نظریں دکان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک قسم قسم کے جوتوں پر رینگ رہی تھیں لیکن اس کی سوچ اسی منظر میں اٹکی ہوئی تھی۔

پھر گلی کی آخری دکان سے جوتے خرید کر وہ واپس گھر کی طرف ہو لیے۔ اب دونوں خاموش ہو گئے تھے۔ عمر نے پھر بولنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ جب کہ ماموں جان دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ کافی دیر دنوں چپ چاپ چلتے رہے، پھر ماموں جان نے آہستگی سے مخاطب کیا۔

”عمر بیٹا! مجھے معلوم ہے کہ تمہاری سوچ ٹھیک ہے، لیکن تم نہیں جانتے، اونچے طبقے نے نچلے طبقے کے لیے اتنی مشکلات کھڑی کر دی ہیں کہ ہم چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے“۔ ماموں جان کے لہجے کا دکھ اس نے بھی محسوس کیا لیکن وہ خاموش رہا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ماموں جان اس سب کو بے سود کہ رہے تھے۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چپ چاپ چلتا رہا۔ گھر تک آتے ہوئے اس نے راستے میں وہی کچھ دیکھا جو وہ پچھلے سال دیکھتا آرہا تھا۔ ہر طرف وہی غلاظتیں بکھری ہوئی تھیں، لڑائی جھگڑے، نفرتیں، جھوٹ، ڈاکے اور غربت...... وہ بستر پر تھکن کے مارے ڈھیر ہو گیا۔ جسمانی تھکن اتنی نہیں تھی جتنی اسے ذہنی تھکن تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر وہی منظر فلم کی طرح چلنے لگا۔

”میں کتنا بے بس ہوں!“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا پھر وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ یکایک سارے گھر میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چلی گئی تھی۔ ”اف یہ بجلی!“ جھنجھلاہٹ کے مارے وہ اٹھ بیٹھا اور برے برے منہ بنانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور ایک طاقچے پر دیا جلا کر رکھ گئیں۔ اب وہ دوبارہ لیٹ کر جلتے دیے کی طرف دیکھنے لگا۔ امی باہر چلی گئی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک اندھیرے میں گھورنے کے بعد پھر دیے کی لو پر نگاہیں جما دیتا۔ اسی طرح دیے کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ صبح جاگا تو اسے اپنے اندر ایک عجیب سی تپش محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ دیے کو دیکھتے دیکھتے سو گیا تھا۔ دیے نے اس کے وجود میں ایک نئی حرارت بھر دی تھی۔ وہ اپنے سینے میں زندگی کی ایک نئی حرارت محسوس کر رہا تھا۔

سورج نکلتے ہی وہ اپنے دوست پڑوسیوں کے گھر کھٹ کھٹانے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کے چار دوست بڑی مشکل سے اس کی بات سن کر اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئے جب کہ دو لڑکے تو اس کی بات سنتے ہی اس پر ہنستے ہوئے واپس چلے گئے تھے۔ اسے دکھ تو ضرور ہوا لیکن وہ جان گیا کہ زندہ لوگوں میں زندگی کی حرارت پیدا کرنا اتنا آسان کام نہیں“۔

”عمر! ایک بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن یہ دوسری بات سمجھ میں نہیں آرہی“۔ اس کا دوست تنویر سنجیدہ ہو کر بولا۔

”جب اندھیرا پھیلتا ہے تو کس طرح ایک دیا روشنی کی علامت بن کر اپنا فریضہ انجام دیا کرتا ہے...... دیا روشنی اور حرارت کی علامت ہے۔ ہمارے چاروں طرف لوگ سانس لیتے ہوئے بھی زندہ نہیں۔ دوستو، اب ہم نے ان چلتے پھرتے اجسام میں حقیقی زندگی کی حرارت دوڑانی ہے“۔

”ٹھیک ہے“ احمد بولا۔ ”ہماری گلی کی صفائی تک تو بات ٹھیک ہے لیکن اتنے بڑے محلے کی صفائی ہم کس طرح کریں گے؟“

عمر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا"ہم پہلا قدم اٹھائیں گے تو راستہ خود بخود بنتا جائے گا"۔

اس کے چاروں دوستوں نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر پانچوں اپنی گلی کی صفائی میں جت گئے۔ کچھ ہی دیر میں گلی کی ساری گندگی ایک جگہ جمع ہو گئی تھی اور گلی صاف ستھری نظر آنے لگی تھی۔ گلی کے سب لوگ حیرت اور تعجب سے بچوں کی لگن دیکھ رہے تھے۔ جب انہوں نے محلے کی دوسری گلیوں کی طرف قدم بڑھایا تو چند بچے پہلے ہی سے ان کے منتظر تھے۔ ان کو سمجھاتے ہوئے عمر کو دیر نہیں لگی کیوں کہ ان کو سمجھانے کے لیے زندگی کی وہ نئی حرارت ہی کافی تھی جو ان کے ننھے دلوں میں دوڑ رہی تھی۔

دو ڈھائی گھنٹوں میں محلّہ صاف ستھرا ہو گیا تھا اور کچرا انہوں نے محلے سے باہر مونسپل کمیٹی کے رکھوائے ہوئے بڑے ڈرم میں پھینک دیا تھا۔ واپس آتے ہوئے اچانک عمر کو محلے کی کمیٹی کے صدر نے روک لیا"کیا بات ہے آج' یہ صفائی مہم



کس خوشی میں ہو رہی ہے؟"

"آپ نے خود ہی تو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا" عمر نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا"کہ نیا سال نئی تبدیلیوں کے ساتھ نمودار ہو گا لیکن افسوس کچھ نہیں بدلا کیوں کہ باتوں سے بھلا کوئی چیز بدلتی ہے...... اس لیے ہم نے ہی ماحول بدلنے کا عزم کر لیا ہے"۔

"بہت اچھی بات ہے" کمیٹی کے صدر کچھ شرمندہ سے ہو کر بولے لیکن کچھ اور نہ کہہ سکے۔ عمر نے انہیں سلام کیا اور دوستوں کے ساتھ واپس چلا آیا۔

اگلی صبح کا سورج عید کا محبتوں سے لبریز پیام لے کر نمودار ہو رہا تھا۔ ان کا محلّہ پہلی دفعہ اجلا اجلا لگ رہا تھا۔ بچے بڑے سب نئے کپڑوں میں ملبوس خوشیاں بانٹ رہے تھے...... گلے مل رہے تھے۔ عمر عید کی خوش ذائقہ سویاں کھا کر سب سے عیدی وصول کر کے گھر سے نکلا اور قریبی رشتہ داروں کے ہاں پہنچ گیا۔ ان سے بھی عیدی وصول کر کے وہ پھوپھی زاد بھائی انور کے ہم راہ اپنے دوستوں کے پاس چلا آیا۔ سب تیار تھے' چاروں کے چہرے مسرت سے تمتما رہے تھے۔ اتنا اطمینان' اتنا سکون پہلے کبھی انہوں نے محسوس نہیں کیا تھا۔

"بھئی کہاں کا پروگرام ہے؟" انور نے انہیں کہیں جانے کے لیے پر تولتے دیکھ کر پوچھا۔

"زیادہ دور کا پروگرام نہیں' تم بھی ساتھ چلو" تنویر نے مسکرا کر جواب دیا اور وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑا۔ یہ چھوٹا سا قافلہ بازار میں ایک گلی کے سامنے رکا تو انور کے چہرے پر حیرت دوڑ گئی۔ چند لمحوں بعد وہ ایک گھر کے کھلے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"کیا چکر ہے؟" انور کے منہ سے حیرت کے ساتھ نکلا۔

"کوئی چکر نہیں' بس دیکھتے جاؤ" تنویر نے کہا اور عمر جھجکتے ہوئے آگے بڑھا۔ عین اسی لمحے ہوا کے تیز جھونکے نے پھٹا پرانا پردہ اڑایا اور پھر دروازے میں نکلی ہوئی لوہے کی ایک پٹی میں اٹک گیا۔ ایک لمحے کے لیے عمر کا دل بڑے زور سے دھڑکا' اس کے سامنے پھر وہی منظر تھا۔ ننگے فرش پر پرانے کپڑوں میں

ملبوس عورت پاؤں پھیلائے بیٹھی تھی اور اس کا شیر خوار بچہ بری طرح رو رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور ننگا بدن سرخ ہو رہا تھا۔ ماں کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ دوسرا بچہ شاید کہیں باہر چلا گیا تھا۔ اس نے حیرت سے سر اٹھا کر عمر اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ”کیا بات ہے...... کون ہو تم لوگ؟“

”ہم......ہم...... بچے ہی ہیں“ عمر نے گھبرا کر گلے میں اٹکی ہوئی تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا‘ پھر جلدی سے سنبھل کر کہا ”دراصل ہم عید کی خوشیوں میں آپ کے بچوں کو بھی شریک کرنے آئے ہیں۔ میرا نام عمر ہے اور یہ میرے دوست ہیں“۔

عورت اس کی بات سن کر چونک اٹھی۔ ”عید کی خوشی میں ہمیں......!“ حیرت سے اس نے بات نامکمل چھوڑ دی۔ پھر ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔ تنویر نے آگے بڑھ کر پلاسٹک کی تھیلی سے ایک برتن نکالا اور کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ گرم گرم دودھ ملی سویوں نے اس کی آنکھوں کی چمک اور تیز کر دی تھی۔

جانے اس وقت کہاں سے اس کا ننگ دھڑنگ بچہ دوڑتا ہوا نمودار ہوا اور برتن پر جھپٹ پڑا۔ ماں نے اسے روکنے کی



کوشش نہیں کی۔ وہ دکھ بھری نظروں سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھتی رہی۔ اسے پتا تھا کہ اس کا بچہ کب سے بھوکا ہے! پھر اچانک اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی اور احساس تشکر سے عمر اور اس کے دوستوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا بچہ کچھ ہی دیر میں گندے ہاتھوں سے سویاں خالی پیٹ میں اتار چکا تھا۔

عمر اور اس کے دوست یہ دل دوز منظر دیکھ رہے تھے اور انور حیرت اور دکھ کے مارے ساکت کھڑا تھا۔ یکایک اس نے چونک کر عمر کی طرف دیکھا۔ عمر نے جیب سے نئے نوٹوں والی جمع شدہ عیدی نکال کر آدھی کر دی اور پھر آگے بڑھ کر عورت کی گود میں جھک کر رکھ دی۔

”ہم کچھ اور تو نہیں کر سکتے لیکن اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ عید کی خوشیاں آپس میں آدھی آدھی بانٹ لیں“ عمر نے کہا۔

انور نے یہ سنا تو اسے ایک جھٹکا سا لگا‘ یہ سب اسے ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ عورت پر بھی سکتے کی حالت طاری ہو گئی تھی۔ اسے بچوں کے اس جذبہ ایثار نے شدید حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حقیقت ہے۔ وہ ابھی حیرت سے عمر کی طرف آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی کہ اس کے چاروں دوست باری باری آگے بڑھے اور اپنی آدھی آدھی عیدی اس کی گود میں رکھ دی۔ پھر عمر اور اس کے دوست کچھ کہے بغیر پلٹے اور دروازے سے نکلنے لگے۔ آج انہیں ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ خود کو زندہ محسوس کر رہے تھے۔

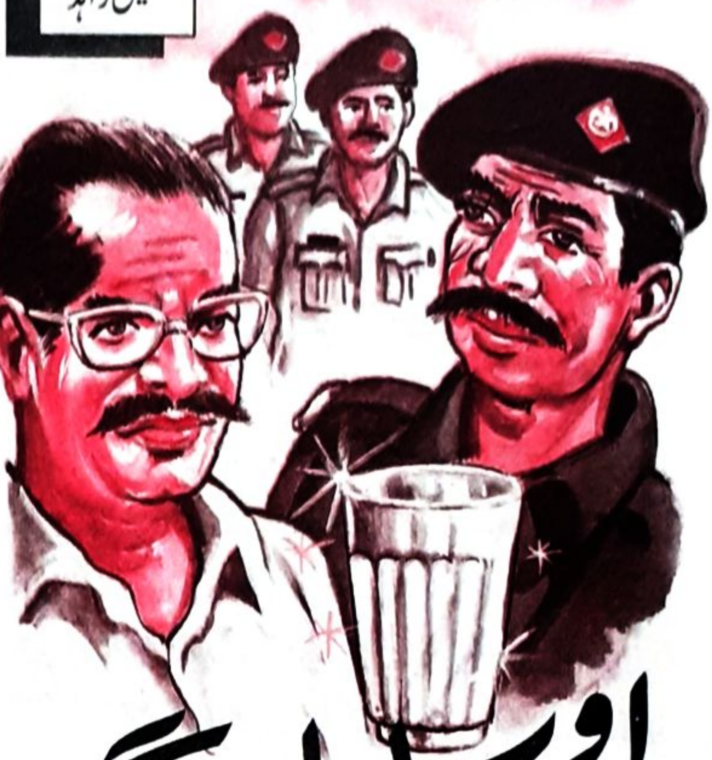
عمر آگے اور باقی دوست اس کے پیچھے نکلے۔ عورت کو انہیں روکنے کا خیال تک نہ آیا۔ باہر نکل کر عمر ٹھٹک کر رک گیا۔

”ارے انور کہاں گیا؟“

”وہ......وہ......ارے وہ رہا!“ تنویر نے کہا۔

سب نے دوبارہ کھلے دروازے کی طرف مڑ کر دیکھا تو چونکے بغیر نہ رہ سکے۔ انور عورت کی گود میں عید کی خوشیاں ڈھیر کر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر عمر کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

شکیل زاہد



اور نشان مل گئے

"میرے اس منصوبے میں کوئی خرابی نہیں" ٹونی نے کہا۔

ریاض نے بوبی کی طرف دیکھا۔ بوبی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے ماتھے پر بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی پھیر رہا تھا۔ ٹونی بھی خاموش ہو کر دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم نے چوکی دار کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" بوبی نے کہا۔ "وہ بھی تو گلیوں میں چکر لگا رہا ہوتا ہے۔ اگر عین وقت پر اس سے مڈھ بھیڑ ہو گئی تو؟"

ٹونی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اس کا انتظام بھی میں نے کر لیا ہے" وہ بولا۔

بیگم شاکر جونہی باورچی خانے میں داخل ہوئیں انہیں محسوس ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ انہوں نے ہر چیز پر ایک نظر دوڑائی۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک لگ رہا تھا لیکن ان کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔ ان کے دن کا زیادہ تر وقت یہیں گزرتا تھا۔ یہاں رکھی ہوئی ایک ایک چیز کی جگہ طے شدہ تھی۔ ماچس بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے غور سے دیکھا۔ "ہر چیز اپنی جگہ پر ہے پھر کیا بات ہے؟" انہوں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر انہیں وہ بات نظر آ گئی۔ وہ ٹرے جس میں گلاس اوندھے کر کے رکھے جاتے تھے، اس میں ایک گلاس سیدھا پڑا تھا۔ انہوں نے کچھ سوچا، پھر اپنے کام میں مگن ہو گئیں۔

ابھی تمام لوگ سو رہے تھے۔ بیگم شاکر نے کیتلی میں چائے کا پانی گرم کرنے کے لیے رکھا۔ دو پیالیاں الماری سے نکالیں اور دودھ نکالنے کے لیے فرج والے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئیں ان کا دل دھک سے رہ گیا۔

کمرے کی حالت ابتر تھی۔ ہر طرف چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ الماریاں کھلی ہوئی تھیں۔ کمرے سے ٹی وی، وی سی آر، کمپیوٹر اور ٹیپ ریکارڈر غائب تھے۔ وہ گھبرا کر ایک اور کمرے میں گئیں۔ وہاں دیوار میں لگا ہوا سیف بھی کھلا ہوا تھا۔ سیف کے اندر زیورات اور نقدی رکھی رہتی تھی۔ اب سیف خالی تھا۔ بیگم شاکر کو چکر آنے لگے۔ وہ لڑکھڑا کر ایک صوفے پر جا گریں۔

"میرے خدایا!" ان کے منہ سے نکلا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا گویا ان کا سانس رک رہا ہے۔ اگرچہ ان کی ٹانگوں میں جان نہ رہی تھی لیکن وہ پھر بھی اٹھیں اور اپنے سونے کے کمرے میں گئیں۔ شاکر صاحب ابھی تک سو رہے تھے۔ انہوں نے شاکر کو کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ "شاکر اٹھو، چور سارا سامان لوٹ کر لے گئے"۔ انہوں نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

شاکر صاحب یوں اچھلے گویا انہیں بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ چند لمحے تک آنکھیں پھاڑے بیگم کو دیکھتے رہے۔

"کیا کہا تم نے؟" وہ بولے

"ٹی وی، وی سی آر، نقدی، زیور، سب کچھ، ہم برباد ہو گئے" شاکر بیگم رو پڑیں۔

شاکر صاحب اب اپنے حواسوں میں آ گئے تھے۔

"تم نے کسی چیز کو ہاتھ تو نہیں لگایا؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاتھ؟ پتا نہیں۔ شاید لگا یا ہو" بیگم بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ "شاکر، اب کیا ہوگا؟"

"حوصلہ رکھو۔ میں ابھی پولیس کو اطلاع کرتا ہوں"۔

"پولیس کیا کرے گی؟"

"کرے گی، کرے گی، تم حوصلہ رکھو"۔

شاکر صاحب اٹھے۔ انہوں نے تکیے کے نیچے سے رومال نکالا اور اسے ہاتھ پر لپیٹ کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔ بیگم انہیں ایسے دیکھ رہی تھی جیسے وہ پاگل ہو گئے ہوں۔ شاکر نے پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا۔

انسپکٹر ارسلان اپنے تین ماتحتوں کے ساتھ شاکر صاحب کے گھر آیا تو وہ اتنی دیر میں گھر کا چکر لگا کر نقصان کا اندازہ کر چکے تھے۔

"جی شاکر صاحب، کچھ اندازہ ہے کہ چور کہاں سے آیا؟" انسپکٹر ارسلان نے پوچھا۔

"جی ہاں چھت سے دروازے کا تالا ٹوٹا ہوا ہے"۔

"آیئے میرے ساتھ" انسپکٹر ارسلان نے کہا۔

شاکر صاحب اسے لے کر سیڑھیوں کی طرف گئے۔ سیڑھیوں کے آخر میں ایک لکڑی کا دروازہ تھا جس میں اندرونی تالا لگا ہوا تھا۔ کسی نے نہایت مہارت سے اسے توڑا تھا۔ دروازے کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

"شاکر صاحب، آپ نے یہ گھر خود بنوایا تھا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں"۔

"آپ نے سیڑھیوں کے دروازے پر لکڑی کا دروازہ لگوا کر پہلی غلطی کی۔ دوسری غلطی یہ کی کہ اسی میں اندرونی تالا لگوایا۔ آپ کو تو کوئی کنڈی لگوانا چاہیے تھی۔ تیسری یہ کہ اگر اندرونی تالا لگوا ہی لیا تھا تو اس کے ساتھ اوپر کی طرف ایک کنڈی لگوا لیتے"۔

"اوپر ایک کنڈی تھی...... وہ دیکھیں اس کا نشان۔ کچھ عرصہ قبل وہ خراب ہو گئی پھر بدلوانے کا خیال نہیں رہا"۔

"آپ نے 20 روپے کی بچت کر کے لاکھوں گنوا دیئے...... خیر آیئے"۔

وہ سیڑھیاں اتر کر اس کمرے میں آ گئے جس میں سیف لگا ہوا تھا۔ انسپکٹر ارسلان ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سیف کے دروازے کو ہاتھ لگایا تو شاکر صاحب بولے۔

"انسپکٹر صاحب! آپ نے انگلیوں کے نشان تو لیے ہی نہیں"۔

"چوری کی اس قسم کی وارداتوں میں انگلیوں کے نشان لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کے وارداتیوں کا ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں"۔

"پھر بھی دیکھ تو لیں" شاکر نے ضد کی۔

"میں نے عرض کیا نا کہ کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں یقیناً چوروں کی انگلیوں کے نشانات مل جائیں گے لیکن ہم ان سے چور پکڑ نہیں سکیں گے۔ اچھا چلیں آپ کہتے ہیں تو میں سیف پر سے نشان اٹھا لیتا ہوں"

انسپکٹر نے اپنے ایک ماتحت کو اشارہ کیا۔

"تھانے جا کر فنگر پرنٹس کا سامان لے آؤ"۔

"جی سر!" ماتحت نے سیلوٹ مارا اور چلا گیا۔

سامان لانے میں 20 منٹ لگے۔ انسپکٹر ارسلان نے سیف کے ہینڈل، دروازے اور اندرونی حصے میں ایک سفوف سا چھڑکا پھر ایک محدب عدسے سے اس جگہ کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ کافی دیر تک ادھر ادھر سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر الجھن یا حیرت کے آثار تھے۔ وہ بار بار نفی میں سر ہلاتا تھا۔ سب اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ جب اس نے عدسہ آنکھوں کے آگے سے ہٹایا تو شاکر صاحب بولے!

"کیا بات ہے انسپکٹر!"

"حیرت ہے" انسپکٹر نے سر ہلایا۔

"بات کیا ہے؟ کچھ بتائیں تو سہی"۔

"یہاں انگلیوں کے نشان ہی نہیں۔ کسی نے مٹا دیئے ہیں"۔

"ہیں؟ کسی نے......؟"

انسپکٹر نے کاندھے اچکائے لیکن چپ رہا۔ وہ چند لمحے

سوچتا رہا پھر دوسری جگہوں پر سفوف چھڑک کر شیشے سے معائنہ کرتا رہا۔ وہ ہر بار نفی میں سر ہلاتا۔

"آپ کے گھر میں کتنے نوکر اور نوکرانیاں ہیں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"دو......ایک مرد اور ایک عورت"۔

"دونوں میاں بیوی ہیں"۔

"جی نہیں"

"انہیں بلوائیں"۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں نوکر آ گئے۔ انسپکٹر نے دونوں کو غور سے دیکھا۔

"یہ جو کرسیاں الٹی پڑی ہیں' انہیں سیدھا کرو"۔

دونوں نے مل کر کرسیوں کو سیدھا کیا۔

"ٹھیک ہے' اب تم دونوں جا سکتے ہو" دونوں چلے گئے تو انسپکٹر نے پوچھا "ان کے نام کیا ہیں؟"

"مرد کا نام رشید ہے اور عورت کا نذیراں"۔

"اچھا اب یہ بتائیں کہ اس کمرے کے علاوہ کہیں کوئی اور چیز الٹ پلٹ ہوئی ہے؟"

شاکر اور بیگم شاکر سوچ میں پڑ گئے۔ یہ سچ تھا کہ سارا کچھ یہیں ہوا تھا۔ شاکر نے نفی میں سر ہلایا۔ انسپکٹر نے بیگم شاکر کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔

"آپ کچھ کہنا چاہ رہی ہیں؟"

"جی ہاں۔ لیکن میرے خیال میں یہ بات اتنی اہم نہیں"۔

"میں نے آپ سے اہم اور غیر اہم کا فیصلہ کرنے کے لیے نہیں کہا۔ یہ میرا کام ہے"۔

"آج صبح جب میں باورچی خانے میں گئی تو وہاں ایک گلاس اپنی جگہ سے ہٹا ہوا تھا"۔

انسپکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"آپ نے اسے اپنی جگہ پر واپس رکھا یا نہیں"۔

"نہیں"

انسپکٹر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"آیئے میرے ساتھ"۔

سب لوگ باورچی خانے میں گئے۔ بیگم شاکر نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ انسپکٹر نے اپنے ماتحت کو اشارہ کیا۔ اس نے گلاس پر سفوف چھڑکا۔ انسپکٹر نے عدسے سے اس کا معائنہ کیا پھر اس نے سب لوگوں کو باورچی خانے سے نکالا اور ٹیلی فون والے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے ایک نمبر گھمایا۔

"ہیلو' ہاں ارسلان بول رہا ہوں۔ احمد اور خالد کو فوراً بھیجو" پھر اسی نے شاکر کے گھر کا پتا بتایا۔

"اب آپ بے فکر ہو جائیں" اس نے شاکر سے کہا۔

"اللہ نے چاہا تو چور پکڑے جائیں گے"۔

پھر چور 6 دن بعد پکڑے گئے۔ ان تینوں میں سے ایک رشید تھا۔ گلاس پر رشید عرف ٹونی کے ساتھی بوبی کی انگلیوں کے نشان تھے۔ انسپکٹر نے چند دنوں تک رشید اور نذیراں کی نگرانی کروائی۔ جب رشید کے ساتھی ریاض اور بوبی کا پتا چلا تو بہانے سے ان کی انگلیوں کے نشان بھی حاصل کر لیے۔ اور پھر بوبی کے نشان گلاس والے نشانوں سے مل گئے۔ اس کے بعد کا کام کافی آسان تھا۔ تینوں نے چند گھنٹوں میں ہی سب کچھ اگل دیا۔ کچھ مال وہ بیچ چکے تھے باقی کا مال شاکر صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔ جب چوری کا مال شاکر صاحب کو مل گیا تو وہ بولے۔

"دیکھا! میں یہی کہ رہا تھا ناں کہ انگلیوں کے نشان مجرم پکڑا دیں گے"۔ "مجرم کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو اور منصوبہ کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو کسی نہ کسی جگہ' کوئی نہ کوئی ایسی غلطی ضرور رہ جاتی ہے جس سے مجرم پکڑا جاتا ہے" انسپکٹر ارسلان نے کہا۔

"کامیابی کا سہرا اپنے سر نہ باندھیں"۔ بیگم شاکر بولیں "آپ شاید بھول رہے ہیں کہ جس گلاس پر سے انگلیوں کے نشان ملے ہیں اس کی نشان دہی میں نے ہی کی تھی۔ اگر میری یہ عادت نہ ہوتی کہ ہر چیز ہمیشہ اپنی جگہ پر رکھوں تو وہ گلاس کبھی میرے ذہن میں نہ کھٹکتا"۔

شاکر صاحب نے قہقہہ لگایا۔ "چلو یوں کہ لیتے ہیں کہ ہم دونوں نے مل کر مجرم پکڑے ہیں"۔

"بالکل ٹھیک"۔ بیگم شاکر بھی مسکرا دیں۔

معلومات

ڈاکٹر رضوان ثاقب

1- ہرکولیس (HERCULES):-

یہ یونانی لفظ ہراکلس (HERACLES) کا لاطینی تلفظ ہے۔ یہ ایک حقیقی آدمی تھا جس کے کارنامے افسانوی حیثیت اختیار کر گئے۔ یونانی داستانوں کے مطابق زیوس اس کا باپ اور ٹیرنیس (TIRYNUS) اس کی ماں تھی۔ انہی داستانوں میں لکھا گیا ہے کہ ہرکولیس جب پیدا ہوا تو زیوس کی بہن اور بیوی ہیرا نے اسے ہلاک کرنے کے لیے سانپ کو مقرر کیا اور ناکامی کی صورت میں متعدد سازشیں کیں لیکن ہرکولیس کو دیوتاؤں نے بچالیا۔

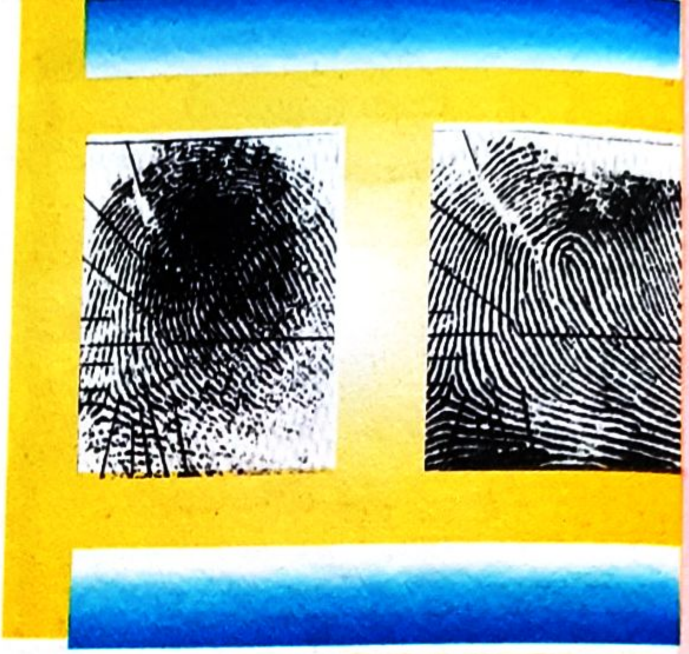
ہرکولیس کو اہل ایتھنز دیوتا سمجھتے تھے اور اس کی پوجا کرتے تھے۔ فنون وادب میں یہ قوت کی علامت ہے۔ اسے مجسمے میں قوی ہیکل، مناسب قدو قامت اور شیر کی کھال پہنے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ اس کا خاص ہتھیار کمان اور عصا ہے، ہرکولیس کی پرستش بطور دیوتا اٹلی والے بھی کرتے تھے۔ وہاں اسے تاجروں کا محافظ دیوتا سمجھا جاتا تھا۔



2- آب حیات یا آب حیواں:-

یہ ایک خیالی چشمہ ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا پانی پی کر آدمی ہمیشہ کی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ آب حیات کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں، جن میں سے حضرت خضرؑ اور سکندر کی کہانی بہت مقبول ہے۔ اس کہانی کے مطابق سکندر حضرت خضرؑ کی رہ نمائی میں چشمہ حیوان تک پہنچا۔ حضرت خضرؑ نے چشمے کا پانی پیا اور وہ لافانی ہو گئے مگر سکندر چشمے کا راستہ بھول گیا اس لیے اس کو ہمیشہ کی زندگی نصیب نہ ہوئی۔ آب حیات سے متعلق فارسی اور اردو شاعری میں بھی نادر مضامین ملتے ہیں۔

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کی مشہور تصنیف کا نام بھی آب حیات ہے۔ اس میں اردو کے مشہور شاعروں کے حالات مع ان کے نمونہء کلام اور تنقید کے درج ہیں۔ اس کتاب کے شروع میں اردو زبان کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور وقتاً فوقتاً اس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں اردو شاعروں کا یہ پہلا جامع تذکرہ ہے۔



3-انگلیوں کے نشانات:-

انسانی شناخت کا یہ مخصوص طریقہ ایک فرانسیسی سراغ رساں ہرٹین نے مرتب کیا۔ اس ایجاد کا مقصد کسی ملزم، مشتبہ یا مجرم کی صحیح شناخت تھا۔ اس کا ایک شعبہ، کسی شخص کے انگوٹھے کے نشان سے اس کی شناخت، تمام دنیا میں رائج ہے۔ یہ شناخت جامع اور مانع ہے یعنی انگوٹھے کے نشان کی صورت میں کسی جعل سازی یا انکار کو دخل نہیں ہوتا۔ تمام ضروری کاغذات پر جہاں جعل سازی کا شائبہ ہو، پڑھے لکھے آدمیوں سے بھی انگوٹھے لگوائے جاتے ہیں۔ مثلاً پنشن کے کاغذات، اور جیل میں بھی ہر قیدی کی پانچوں انگلیوں کے نشان لیے جاتے ہیں۔ تاکہ مجرم بعد میں اگر حلیہ اور نام بھی تبدیل کر لے تو فوراً شناخت کیا جا سکے۔

مغربی ممالک میں ہر مجرم کے انگوٹھے کے نشان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جس سے اس کے جرم کے ثبوت میں مدد مل سکتی ہے۔ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشانات سے چور اور ملزم کا کھوج بھی لگایا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص چوری کرتا ہے تو وہ کسی نہ کسی جگہ اپنی انگلیوں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔ خواہ وہ دروازہ ہو یا موٹر کار یا بکس وغیرہ۔ ان نشانات کو کیمیاوی اشیا سے سرخ کر کے شناخت کیا جاتا ہے اور مجرموں کے سابقہ نشانات سے جو بطور ریکارڈ محفوظ ہوتے ہیں، مقابلہ کر کے اس کے سابقہ جرائم کی تفصیل بھی مل جاتی ہے۔ پاکستان میں جانگلی لوگ پاؤں کے کھوج سے ملزم کا پتا لگاتے ہیں۔ ان کی سراغ رسانی اس قدر تیز ہوتی ہے کہ ان پر غیب دانی کا شبہ ہوتا ہے۔

4-امرت:-

اس کے لغوی معنی آب حیات ہی ہیں۔ ہندی دیو مالا کے مطابق جب دیوتاؤں اور اپسراؤں میں جنگ ہوئی اور دیوتاؤں کو شکست ہوئی تو انہوں نے وشنو سے فریاد کی، جنہوں نے حکم دیا کہ سمندر کو بلویا جائے۔ کوہ وندھیا چل مدھانی (رئی) بنا، شیش ناگ رسی بنا اور دیوتاؤں نے سمندر کو بلویا۔ دیگر اشیا کے علاوہ اس سے امرت پیدا ہوا جسے دیوتاؤں نے پی کر اپسراؤں پر فتح پائی۔



5-عبرانی (HEBREW):-

یہ یہودیوں کی قدیم ترین زبان ہے۔ عہد قدیم کی بیشر تر تحریریں عبرانی میں ملتی ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں عبرانی زبان نے کافی نشوونما پائی اور اب بھی فلسطین کے یہودیوں کی یہ قومی اور سرکاری زبان ہے۔ یہ دائیں سے بائیں ہاتھ کی طرف لکھی جاتی ہے۔



آئیے مسکرائیں

"صبح صبح منا جب پلیٹ اور چمچ لے کر صحن میں جا رہا تھا تو امی جان نے پوچھا "منے 'کدھر جا رہے ہو؟" منے نے کہا "میں تازہ ہوا کھانے جا رہا ہوں
(سید حمید شاہ راولپنڈی)

ڈاکٹر (مریض سے): لیجیئے میں نے آپ کا دانت نکال دیا۔

مریض: کتنی فیس ہوئی۔

ڈاکٹر: پچاس روپے

مریض: میرے پاس تو سو کا نوٹ ہے

ڈاکٹر: تو کیا ہوا آیئے میں آپ کا ایک اور دانت نکال دیتا ہوں
(محمد عمران اکرم نظام پورہ دیوا سنگھ)

ایک دوست (دوسرے دوست سے): مجھے اپنا فون نمبر لکھوا دو۔

دوسرا دوست: ابھی میرے پاس ٹائم نہیں فون کر کے پوچھ لینا
(فریحہ ہما ڈیرہ غازی خان)

پڑوسن نے دوسری سے ایک کتاب پڑھنے کے لیے مانگی تو اس نے کہا "بہن' میں کتاب دیا نہیں کرتی آپ جتنی چاہیں یہاں بیٹھ کر پڑھ لیں"۔

چند روز بعد دوسری پڑوسن پہلی کے گھر گئی اور جھاڑو مانگا۔ پہلی نے کہا "بہن' میں کسی کو جھاڑو نہیں دیا کرتی' آپ کو جتنی جھاڑو دینا ہو یہاں میرے گھر میں دے لیں
(سمیعہ علی ڈھکو شور کوٹ)

ایک خاتون کی یادداشت بہت کم زور تھی۔ اس نے ایک ایسے شخص کی خدمات حاصل کیں جو یادداشت بڑھانے کی تربیت دیا کرتے تھے۔ پہلا سبق دینے کے بعد ماہر گھر سے نکلا تھا کہ چند لمحوں بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ خادمہ نے دروازہ کھولا اور اپنی مالکہ کو بتایا کہ دروازے پر ماہر یادداشت صاحب کھڑے ہیں' وہ اپنی چھتری یہاں بھول گئے ہیں۔
(محمد احمد لاہور)

ایک صاحب اپنے مکان کے سامنے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ ایک فقیر نے سوال کیا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا پھر کہنے لگے "پھر کسی وقت آنا ابھی گھر میں کوئی آدمی نہیں ہے"۔

فقیر عاجزی سے بولا "جناب تھوڑی دیر کے لیے آپ ہی آدمی بن جائیں"
(مرزا مبشر حسین شاہ کوٹ)

شوقیہ گلوکار کو کچھ لوگوں نے اپنے گھر گانا سنانے کے لیے بلایا تو گلوکار نے بڑے اسٹائل سے پوچھا "سب سے پہلے کون سا گانا سناؤں؟"

"کوئی سا بھی سناؤ ہمیں تو پڑوسیوں سے مکان خالی کروانا ہے" لوگوں میں سے ایک نے کہا۔
(فیض الحسن کوٹ ادو)

پولیو کے قطرے پلانے والا عملہ ایک مکان کے سامنے رکا اور مکان کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک آدمی باہر آیا تو ڈاکٹر نے بتایا "ہم بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے آئے ہیں"۔

اس آدمی نے اپنے بڑے بیٹے کو آواز دی: "بیٹا! پسٹل اور بندوق کو لے آؤ"

عملہ نے یہ سنتے ہی دوڑ لگا دی۔ وہ آدمی بولا "ٹھہرو بھئی' یہ میرے چھوٹے بیٹے اور بیٹی کے نام ہیں"
(میمونہ شکور اوڈ عبدالحکیم)

امرت

حامد مشہود



گھوڑا اپنے گھڑ سوار کے بغیر واپس آجائے تو ایک کہرام مچ جاتا ہے۔ ہر کوئی یہ جان جاتا ہے کہ اس کا سوار کسی افتاد کا شکار ہو چکا ہے۔ ایک جوان گھوڑا جب خالی زین لیے ہرکولیس کے لشکر میں پہنچا تو سب کا ماتھا ٹھنکا۔ گھوڑے نے خیموں میں چکر کاٹتے ہوئے ہنہنانا شروع کر دیا جیسے وہ بے زبان اپنے سوار پر پڑنے والی آفت کا تذکرہ کر رہا ہو۔ ایک جنگ جو اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھا تو وہ اپنے پچھلے سموں پر کھڑا ہو گیا۔ جنگ جو نے اسے پچکار پچکار کر رام کیا اور اس کے گلے میں مضبوط ڈوری سے بندھا ہوا شاہی فرمان کھول کر ہرکولیس کے خیمے پر حاضر ہوا۔

خیمے کے اندر وسیع تخت پر لمبا چوڑا مرد گاؤ تکیے سے ٹک لگائے نیم دراز تھا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد کوئی مشروب پی رہا تھا۔ اسی مرد آہن کا نام ہرکولیس تھا جو یونان سے پوری دنیا کو فتح کرنے کا عزم لے کر اٹھا تھا اور کئی مملکتوں کو فتح کرتا ہوا آخر کار اس دور کے بڑے اور ترقی یافتہ شہر چابل تک آن پہنچا تھا۔

ہرکولیس نے اس وقت مختصر لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے بدن پر کئی نشانات اس کی جنگی زندگی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ اس کا چہرہ تو تنا ہوا ہی تھا مگر آواز بھی درشت تھی۔ وہ کرخت لہجے میں بولا "شاہ بخت ور نے میرا قاصد قتل کر کے بہت برا کیا ہے۔ پڑھو اس بد بخت نے کیا پیغام بھیجا ہے"۔

ایک عبرانی زبان جاننے والے سپاہی کو بلایا گیا تو اس نے خط پڑھ کر سنایا۔

"شہنشاہ ہرکولیس کو ہمارا اسلام ہو

اے عظیم فاتح! بخت ور تجھے چابل کی ہواؤں سے لطف اندوز ہونے پر مبارک باد دیتا ہے۔ چابل کا مضبوط شہر صرف ہمارے لیے ہے۔ تیری تشریف آوری پر ہم تجھے خوش آمدید کہتے ہیں مگر بہتر یہی ہے کہ اپنا لشکر لے کر یہاں سے چلے جاؤ ورنہ انجام برا ہو گا۔ تمہارا قاصد ہمارے لیے قابل احترام ہے۔ اس لیے ہم نے اسے سرکاری مہمان بنالیا ہے۔ اسے ہم جلد لوٹا دیں گے۔ (فقط شاہ بخت ور)

غضب ناک ہرکولیس نے مشروب کی لمبی چسکی لے کر برتن توڑ ڈالا۔ وہ زخمی شیر کی طرح دھاڑا۔ اس نے لشکر کو روانی کا حکم دیا۔

دوسرے روز ہرکولیس کا لشکر منزلوں پہ منزلیں مارتا چابل کی طرف روانہ ہوا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں ایک تسلسل کے ساتھ ابھر رہی تھیں اور ہرکولیس کی ننگی تلوار دھوپ کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ جنگ جوؤں کے ہاتھوں میں تھامے ہوئے نیزے اور بھالے گھوڑوں کے جھٹکوں سے لرز رہے تھے۔ وہ سب ہر گام پر اپنے تنومند جنگی گھوڑوں کو ایڑ لگاتے تھے تاکہ جلد از جلد چابل کے در و دیوار نظر آئیں۔ ہر طرف دھول اڑاتا ہوا یہ عظیم لشکر جب چابل تک پہنچا تو ہرکولیس دم بخود رہ گیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ چابل کی فصیل مضبوط اور بلند ہے مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ فصیل ایسی مضبوط ترین اور بلند و بالا ہو گی۔ شہر کے پھاٹک بند کر دیئے گئے تھے اور فصیل پر بنی ہوئی برجیوں میں ماہر تیر انداز گھات لگائے بیٹھے تھے جو دور سے نظر نہیں آتے تھے۔

لشکر نے اپنی صف بندی کی اور اہل چابل کو للکارا۔

دوسری طرف قبرستان جیسی گہری خاموشی چھائی رہی۔ ہرکولیس کے حکم پر چند لشکری کمندیں تھام کر فصیل کی طرف بڑھے، مگر فصیل کے پاس جاتے ہی ان پر تیروں کی بوچھاڑ ہوئی اور وہ زخمی ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر فصیل کے اوپر سے چوبرجی میں سے ایک تیر انداز نے تاک کر ہرکولیس کے ہاتھی کو نشانہ بنایا۔ ہرکولیس نے ہاتھی پر سے کود کر اپنی جان بچائی اور ہاتھی نے کئی افراد کو کچل کر ہڑبونگ مچادی۔ سارا لشکر مایوسی کے عالم میں بکھر اپڑا تھا۔ صفیں ٹوٹ چکی تھیں اور ترتیب غلط ہوچکی تھی۔

شاہ بخت ور ہرکولیس کے لشکر کا سامنا کر کے اپنی فوج کا نقصان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس جنگی سازو سامان کی قلت نہ تھی۔

شہر کے گرد دوہری فصیل تھی۔ فصیل کے اندرونی طرف چوڑی آبی خندق بنائی گئی تھی۔ شہر میں سے ایک تیز رفتار دریا کا گزر ہوتا تھا۔ اس دریا کے اوپر بھی فصیل تھی اور پانی کے اندر لمبے نیزے چھپائے گئے تھے تاکہ اگر کوئی اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو ان میں پرو دیا جائے۔

پڑاؤ کے دوسرے روز ہرکولیس کا ایلچی "تھیلز" رہائی پا کر آگیا۔ اس نے ہرکولیس کو بتایا کہ کوئی عامرہ نامی عورت چابل میں داخل ہونے کا راز جانتی ہے۔ اسے فوری طور پر تلاش کرنا چاہیے۔

"تجھے یہ بھید کیسے ملا؟" ہرکولیس نے پوچھا۔

"جناب! میں قید خانے میں آنکھیں موند کر لیٹا تھا کہ دو پہرے داروں کی گفت گو میں نے سنی کہ عامرہ کے متعلق یونانی کچھ نہیں جانتے۔ وہ ناکام لوٹ جائیں گے۔ ویسے بھی چند دنوں تک جاڑا زور پکڑ لے گا اور انہیں واپس جانا ہی پڑے گا"۔

تھیلز نے ادب سے جواب دیا "جناب! وہ آپس میں عبرانی زبان میں بات کرتے تھے اور میں عبرانی جانتا ہوں۔ میں نے ان کی بات سے یہ اندازہ کیا کہ عامرہ شہر سے باہر بیابان میں رہتی ہے"۔

ہرکولیس کے جاسوس چار سو پھیل گئے۔ دن رات کی جاسوسی کے بعد بھی عامرہ کا پتا نہ چل سکا۔ عامرہ جڑی بوٹیاں ڈھونڈ کر ان سے نایاب ادویات بناتی تھی۔ شاہ بخت ور کی بیٹی ایک بار بیمار پڑ گئی تھی تو شاہی طبیب اس کے علاج سے عاجز آ گئے تھے۔ اس زمانے میں عامرہ نے پہلی بار محل میں قدم رکھا اور شہزادی کا علاج شروع کیا۔ وہ چند دنوں بعد ہی اچھی بھلی ہو گئی۔ شاہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ شہزادی زہرہ صحت یاب ہو گئی ہے۔ اس نے بہت دھوم دھام سے اس کا جشن صحت منایا مگر خوددار عامرہ نے شاہ سے ایک سکہ بھی نہ لیا۔

بات یہ تھی کہ عامرہ بہت قناعت پسند عورت تھی۔ اسے زیادہ کی ہوس نہیں تھی۔ بس دو وقت کی روٹی کے لیے دوا دارو کرتی تھی۔ شاہ بخت اس کی خودداری اور دانش مندی کا معترف اور قائل ہو گیا۔ وہ کبھی کبھار شہر سے نکل کر اس کی جھونپڑی پر حاضر ہوتا اور اس سے اچھی اچھی باتیں سنتا۔

عامرہ اپنی جھونپڑی سے اس لیے غائب تھی کہ وہ جڑی بوٹیاں ڈھونڈنے کے لیے کہیں دور چلی گئی تھی اور ہرکولیس کے مخبر اسے شکاری کتوں کی طرح ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ عامرہ کو پہچاننے کے لیے انہوں نے چند مقامی لوگوں کو روپے پیسے دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

پھر ایک دن عامرہ بیابانوں میں سے جڑی بوٹیاں ڈھونڈ کر اپنی رہائش کی طرف لوٹ رہی تھی کہ ہرکولیس کے آدمی اسے اٹھا کر اپنے لشکر میں لے گئے۔ ہرکولیس اس وقت سرد ہوا کے جھکڑ سے بچنے کے لیے موٹا کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔ اس نے عامرہ کو گھور کر دیکھا پھر عبرانی جاننے والے ایلچی کو بلوایا گیا اور بات چیت کا آغاز اس ایلچی کی وساطت سے ہوا۔

ہرکولیس نے پوچھا "عورت! تم جانتی ہو کہ اس شہر میں داخل ہونے کا کوئی چور راستہ بھی ہے۔ میں تجھے سونے میں تول دوں گا لہٰذا وہ راہ مجھے بتا دو"۔

عامرہ دم بخود رہ گئی کہ اسے اس راہ کا کیوں کر معلوم ہوا۔ وہ راہ ایک خفیہ سرنگ تھی جو دریا کے قریب سے شروع ہو کر محل تک جاتی تھی۔ اس کا ایک منہ دریا کے پاس شہر کے باہر تھا۔ وہ سرنگ شاہ بخت ور نے عامرہ کے مشورے پر بنوائی تھی۔



عامرہ کا خیال تھا کہ طویل محاصرے کی صورت میں شہر والے نہ صرف جابل سے باہر نکل سکیں گے بلکہ دشمن پر حملہ بھی کر سکیں گے۔ اس سرنگ کا راز صرف چند سینوں میں محفوظ تھا۔ کسی سینے نے بے وفائی کی تھی اور وہ راز قید خانے کے پہرہ داروں تک پہنچا تھا اور پھر ان کی بے احتیاطی سے وہ راز یونانیوں کے لشکر تک جا پہنچا تھا۔

عامرہ پر عزم لہجے میں بولی "میں کچھ نہیں بتا سکتی"۔

ہرکولیس کی غیظ و غضب سے آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

اس نے ہاتھی کی طرح چنگھاڑ کر کہا "اے عورت! میں دنیا فتح کرنے نکلا ہوں، تیری یہ مجال کہ تو انکار کرے...... میں تیرا بدن چیر کر تیرے دل سے وہ بھید نکالوں گا"۔

عامرہ نے پر اعتماد لہجے میں کہا "تو مجھے مار نہیں سکتا"۔

ہرکولیس نے اپنے قریبی سپاہی کی تلوار اس کی میان میں سے کھینچ لی۔

"پاگل! میں نے آج امرت پی لیا ہے۔ تو دنیا کا اتنا بڑا سپہ سالار ہے مگر تو کل کلاں ساری دنیا فتح کر کے بھی مر جائے گا اور میں اتنی چھوٹی سی عورت دنیا دیکھے بغیر بھی امر رہوں گی۔ تو تو بہت بد نصیب ہے۔ کہو تو میں تجھے بھی اس بوٹی کا رس پلا دوں پھر تم بھی زندہ و جاوید رہنا"

عامرہ نے کہا۔

غضب ناک ہرکولیس چند لمحوں کے لیے تو ٹھٹک گیا۔

اس نے سن رکھا تھا کہ آب حیات پینے والا شخص ہمیشہ کے لیے زندہ رہتا ہے یعنی امر ہو جاتا ہے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ عامرہ نے پھر اسے مسکرا کر تلوار آزمانے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی کہا "تو مر جائے گا اے فاتح!"

ہرکولیس خاموش ہو گیا تھا مگر غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ دو ٹکے کی سنیاسی عورت زندہ رہے اور ایک عظیم فاتح مر جائے، یہ کس قدر شرمندگی کی بات ہو گی۔ اس نے اپنی تلوار آزمانے کا فیصلہ کیا تاکہ عامرہ کے آب حیات کے دعوے کی تصدیق کے بعد وہ بھی امرت پی کر امر ہو جائے۔ اس نے پورے کروفر سے قدم بڑھایا اور عامرہ پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ عامرہ کی نازک سی گردن تن سے جدا ہو گئی اور خون بہ نکلا۔ خفیہ سرنگ کا راز عامرہ ساتھ لے کر مر گئی تھی۔ اس نے شہر سے باہر رہنے کے باوجود اندر والوں کو خون خرابے سے بچا لیا تھا۔

ہرکولیس اب ساری بات سمجھ گیا۔ ہزاروں جری مردوں کا مان توڑنے والا ایک حب الوطنی سے بھرپور عورت کے آگے ہار گیا تھا۔ عامرہ کے کٹے ہوئے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ اس کے ہونٹ تب بھی مسکرا رہے تھے۔ ہرکولیس نے آنکھیں بند کر کے لمبی آہ بھری اور آہستگی سے اس عورت کو سلام کیا اور واپسی کی ٹھانی۔ کیوں کہ عامرہ تو ملک و ملت کی محبت کا امرت پی کر امر ہو گئی تھی مگر ہرکولیس کو تو بہر حال ایک نہ ایک دن مرنا ہی تھا۔

* * *

مشکا کا دلیہ



فرحانہ پارس

پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں میں مشکا ہمارے گاؤں رہنے آیا۔ میں بہت خوش ہوا۔ کیوں کہ میں اسے بڑا یاد کرتا تھا۔ امی جان نے کہا ”مشکا مجھے تمہارے آنے کی بڑی خوشی ہوئی ہے۔ اب تم دونوں مل کر خوب کھیلنا اور سیر کرنا“ پھر تھوڑی دیر بعد بولیں۔ ”اوہ یاد آیا‘ کل صبح میں ایک ضروری کام سے شہر جارہی ہوں کچھ کہ نہیں سکتی کہ واپس کب آؤں۔ لیکن کم از کم دو دن تو ضرور لگ جائیں گے۔ اچھا ہوا جو تم آگئے۔ اب صرف یہ گھر پر اکیلا نہیں ہوگا۔ کیا تم دونوں دو دنوں تک گھر سنبھال سکتے ہو؟“

”بالکل‘ سنبھال سکتے ہیں“ میں بولا ”ہم بچے تو نہیں ہیں“۔

تم دونوں کو ناشتا بھی خود ہی بنانا پڑے گا۔ کیا تمہیں دلیا پکانا آتا ہے؟“ امی نے پوچھا

”آنٹی‘ مجھے پکانا آتا ہے“ مشکا بولا ”یہ تو بہت ہی آسان ہے“۔

”مشکا“ میں نے پوچھا ”کیا سچ مچ تمہیں دلیا پکانا آتا ہے؟ پہلے کبھی تم نے پکایا ہے؟“

” پریشان نہ ہوں‘ میں نے اپنی امی کو دلیا پکاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس لیے میں بھی پکا سکتا ہوں۔ تم یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں تمہیں بھوکا نہیں مرنے دوں گا اور ایسا لذیذ دلیا پکا کر کھلاؤں گا جو تم نے ساری عمر چکھا نہ ہوگا“۔

اگلی صبح امی جان نے ہمیں ناشتا کروایا اور پھر ہمیں گندم دکھائی اور دلیا پکانے کی ترکیب بتائی لیکن میں نے سننے کی ذرا بھی زحمت نہ کی کیوں کہ دلیا مشکا کو جو پکانا آتا تھا۔

جب امی چلی گئیں تو میں نے اور مشکا نے مچھلیاں پکڑنے کا پروگرام بنایا اور دونوں مچھلی پکڑنے کا سامان اٹھا کر گیلی زمین سے کیچوے نکال کر دریا کی طرف چل پڑے ”ایک منٹ ٹھہرو“ میں نے کہا ”اگر ہم مچھلیاں پکڑنے چلے گئے تو دلیا کون پکائے گا؟“

”ہم کچھ اور کھالیں گے‘ جب بہت زیادہ بھوک لگے گی تب دلیا بھی پکالیں گے“

پھر ہم دریا پر پہنچ گئے۔ پہلے خوب نہائے اور تیرے پھر ریت پر لیٹ کر اپنے جسم اور کپڑے سکھائے۔ اس کے بعد کانٹے پر کیچوے لگا لگا کر پانی میں ڈال کر مچھلیوں کا انتظار کرنے لگے لیکن وہاں ہمیں کوئی ڈیڑھ درجن چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ اس طرح ہم نے دریا پر تقریباً آدھا دن ضائع کر دیا۔

سہ پہر کو ہمیں شدید بھوک لگی تو کچھ کھانے کے لیے گھر کی طرف بھاگے۔

”اب بات یہ ہے کہ تم تو کھانا پکانے میں ماہر ہو“ میں نے مشکا سے کہا۔ ”تو ایسا کرتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز بناتے ہیں جو کم سے کم وقت میں پک جائے۔ کیوں کہ میں تو بھوک سے مرا جارہا ہوں“۔

”دلیا پکا لیتے ہیں“ مشکا بولا ”وہی سب سے آسان ہے“۔

”ٹھیک ہے“ میں نے کہا

ہم دونوں کام کرنے لگے۔ میں نے چولہا جلایا۔ مشکا نے بڑا سا پتیلا اٹھایا اور اس میں گندم ڈالنے لگا۔

”کافی سارا دلیا پکانا کیوں کہ میں تو اتنا بھوکا ہوں کہ پورا پتیلا بھی کھا سکتا ہوں“ میں نے کہا۔

مشکا نے یہ سن کر پتیلے کو گندم سے بھر دیا اور پھر اس کے

کناروں تک پانی ڈال دیا۔ "لگتا ہے تم نے پانی زیادہ ڈال دیا ہے"۔ میں نے ٹوکا۔

"نہیں بھئی، میری امی بھی ایسے ہی پکاتی ہیں۔ تم زیادہ باتیں مت کرو اور صرف چولہے کی آنچ کا خیال رکھو باقی مجھ پر چھوڑ دو"۔
اس نے یہ کہا اور دلیا پکانے لگ گیا۔ میں بیٹھ گیا اور مشکا بھی چولہے کے پاس ہی بیٹھ کر دلیا پکانے لگا بلکہ وہ بس پاس بیٹھا ہی رہا کیوں کہ دلیا تو خود بخود پک رہا تھا۔

شام ہوتے ہی میں باورچی خانے کی بتی جلانے کے لیے اٹھا۔ جب واپس مڑا تو میں نے مشکا کو آنکھیں بند کئے گانا گاتے دیکھا اور میری نظر پتیلے پر پڑی۔ پتیلے کا ڈھکن اوپر اٹھ رہا تھا اور دلیا ابل ابل کر باہر گر رہا تھا۔

"ہائے مشکا" میں چیخنے لگا۔ "دلیے کو پتا نہیں کیا ہو رہا ہے"۔
"کیوں کیا ہوا ہے دلیے کو؟" مشکا نے آنکھیں کھول دیں۔
"دلیا ڈھکن اٹھا کر باہر آ رہا ہے" میں نے اسے بتایا۔
مشکا نے جھپٹ کر چمچہ اٹھایا اور باہر گرتے ہوئے دلیے کو واپس پتیلے میں دھکیلنا شروع کر دیا۔ وہ بار بار اسے اندر ڈالتا رہا لیکن دلیا مسلسل پھول کر باہر گرتا رہا۔
"پتا نہیں یہ ایسے کیوں کر رہا ہے؟ ہو سکتا ہے پک گیا ہو"۔
میں نے دلیے کا ایک چمچہ نکال کر چکھا لیکن گندم ابھی تک خشک اور سخت تھی۔
"سارا پانی کہاں چلا گیا؟" میں نے پوچھا۔
"پتا نہیں" مشکا بولا "میں نے تو ڈھیر سارا پانی ڈالا تھا، پتیلے میں سوراخ تو نہیں؟"

ہم نے ہر طرف سے پتیلے کو دیکھا لیکن وہاں سوراخ کا نام نشان تک نہیں تھا۔
"پانی بھاپ بن کر اڑ گیا ہو گا" مشکا نے خیال ظاہر کیا۔ "اب پھر پانی ڈالنا پڑے گا"
پھر اس نے چمچے کے ساتھ کچھ دلیا پلیٹ میں نکالا تاکہ پانی ڈالنے کے لیے پتیلے میں جگہ بن سکے۔ اب اس نے پانی ڈال کر پتیلے کو دوبارہ چولہے پر رکھ دیا۔
دلیا پکتا رہا، پکتا رہا اور یقین کریں کہ تھوڑی دیر بعد ڈھکن پھر اونچا ہو گیا اور دلیا آہستہ آہستہ پھر باہر آنے لگا۔

میں نے کہا "مشکا تم نے اس میں بہت زیادہ گندم ڈال دی ہو گی۔ اسی لیے وہ پکتے ہوئے پھول جاتی ہے اور چوں کہ پتیلے میں اس کو جگہ نہیں ملتی تو وہ پھر باہر نکل آتی ہے"۔
"ہاں یہ ہی ہو رہا ہو گا۔ لیکن یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا ہے۔ یاد کرو تم نے ہی کہا تھا کہ تمھیں بھوک زیادہ لگی ہوئی ہے اس لیے زیادہ سارا دلیا پکاؤں"۔
"تو مجھے کیا پتا تھا کہ دلیے میں کتنی گندم ڈالنی ہے۔ یہ تو تمھارا دعویٰ تھا کہ تمھیں دلیا پکانا آتا ہے" میں نے جواب دیا۔
"وہ تو آتا ہی ہے۔ اگر تم نے بار بار مداخلت نہ کی ہوتی تو اب تک دلیا پک بھی گیا ہوتا" وہ بولا۔
"تو ٹھیک ہے اب پکالو میں ایک لفظ بھی نہیں بولوں گا" میں ناراض ہو کر تھوڑی دور بیٹھ گیا۔ مشکا پکتے ہوئے دلیے کے پاس بیٹھ گیا اور زائد دلیا پلیٹوں میں نکالتا رہا اور اس کی جگہ گلاس بھر بھر کر پانی ڈالتا رہا۔ جلد ہی ادھ پکے دلیے کی پلیٹوں سے میز بھر گئی۔ ہر دفعہ وہ پتیلے میں مزید پانی ڈال دیتا۔ آخر کار میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔
"تم ٹھیک طرح سے تو نہیں پکا رہے۔ اس طرح تو دلیا کل صبح تک بھی نہیں پکے گا"۔
"بڑے بڑے ہوٹلوں میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔ کیا تمھیں نہیں پتا ہوٹلوں والے رات کو کھانا پکانا شروع کرتے ہیں تاکہ وہ صبح تک تیار ہو جائے" مشکا نے بتایا۔
"یہ سب بڑے ہوٹلوں میں ہی ہو سکتا ہے کیوں کہ ان کے پاس کھانے کی اور بھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں اس لیے انھیں کوئی جلدی نہیں ہوتی" میں نے اسے سمجھایا۔
"جلدی تو ہمیں بھی نہیں" مشکا اطمینان سے بولا۔
"کیا ہمیں جلدی نہیں؟ مشکا، میں بھوک سے مرنے والا ہوں اور مزید یہ کہ سونے کا وقت ہو گیا ہے" میں بے صبری سے بولا۔
"سونے کا وقت ہو گیا ہے تو سو جاؤ" مشکا پتیلے میں پانی کا ایک اور گلاس ڈالتے ہوئے بولا۔ اچانک مجھے پتا چل گیا کہ کیا غلطی ہو رہی ہے۔
"اگر تم ٹھنڈا پانی ڈالتے رہو گے تو یہ کبھی بھی نہیں پکے گا"

میں نے کہا۔

"یعنی تمہارا خیال ہے کہ پانی کے بغیر ہی دلیا پک جائے گا" وہ بولا۔

"نہیں، میرا خیال ہے کہ اب بھی پتیلے میں گندم بہت زیادہ ہے۔ اسے کم کر لینا چاہیے" یہ کہ کر میں نے پتیلے میں سے آدھا دلیا نکال لیا اور مشکا سے کہا کہ اس میں پانی ڈال دے۔

مشکا نے مگ اٹھایا اور بالٹی میں سے پانی لینے بھاگا۔

"بالٹی میں پانی نہیں ہے" وہ بولا۔

"تو اب کیا کریں؟ اندھیرا ہو گیا ہے اب تو ہمیں کنواں بھی نظر نہیں آئے گا"۔

اس نے ماچس پکڑی، بالٹی کے ہینڈل کے ساتھ رسی باندھی اور ماچس کی تیلیاں جلا جلا کر کنویں تک چلا گیا مگر چند منٹوں بعد وہ واپس آ گیا۔

"پانی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پانی؟ وہ تو کنویں میں ہے" مشکا بولا۔

"احمق! اور بالٹی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالٹی؟ وہ بھی کنویں میں"

"کنویں میں؟"

"جی ہاں"

تمہارا مطلب ہے تم نے بالٹی کنویں میں گرا دی ہے؟"

"بالکل"

"اوہ عجیب انسان، اس طرح تو ہم بھوکے مر جائیں گے۔ اب پانی کیسے نکالیں گے؟" میں اس پر برسنے لگا۔

"کیتلی کے ذریعے پانی نکال لیں گے" اس نے کہا۔

میں نے کیتلی پکڑی "مجھے رسی پکڑاؤ"۔

"وہ میرے پاس تو نہیں" مشکا نے جواب دیا۔

"تو کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"نیچے"

"نیچے کہاں؟" میں چلایا۔

"کنویں میں" وہ بولا۔

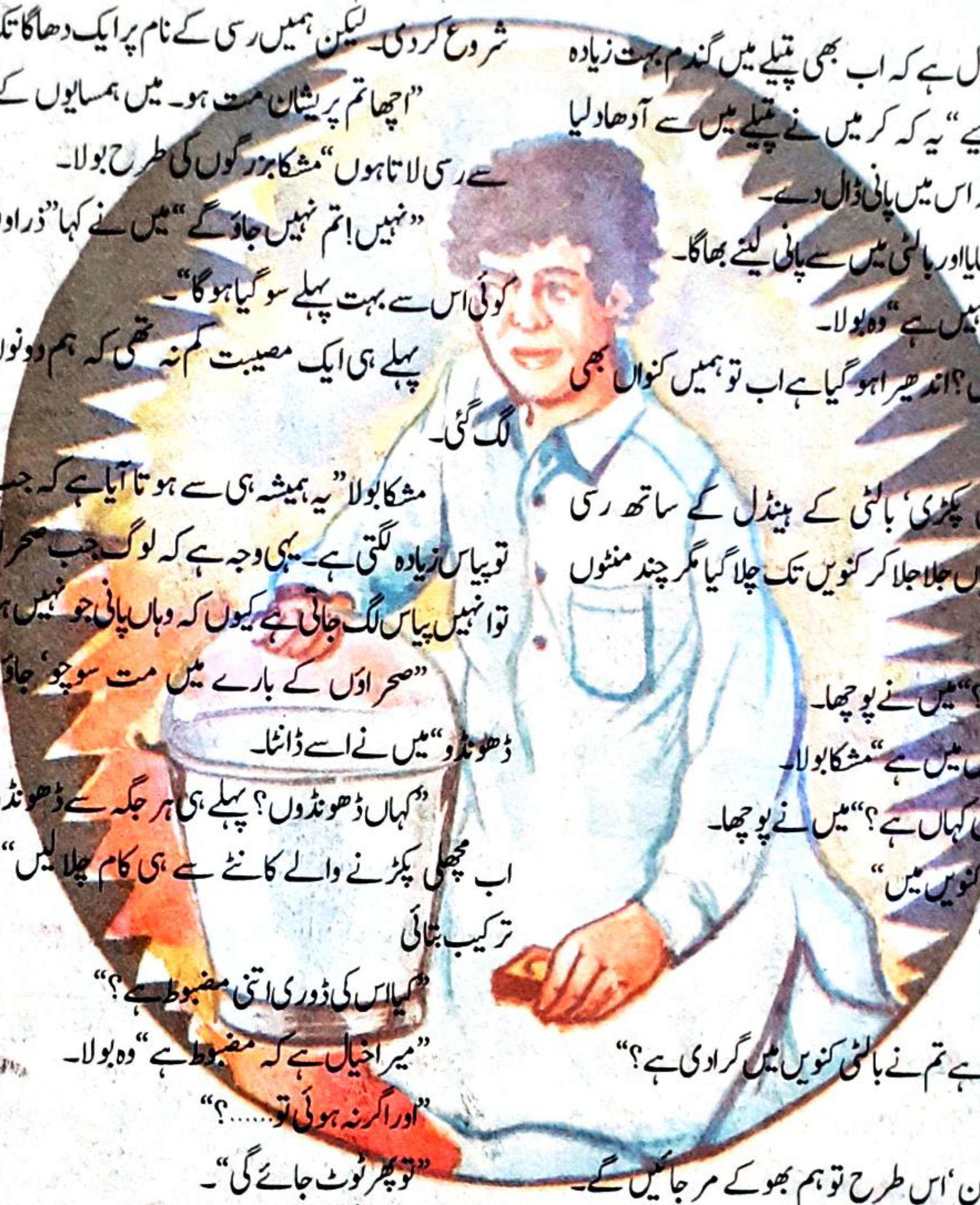
"یعنی بالٹی رسی سمیت کنویں میں گر گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"تو اور کیا" وہ بولا۔

پھر ہم دونوں نے جلدی جلدی کوئی اور رسی تلاش کرنی شروع کر دی۔ لیکن ہمیں رسی کے نام پر ایک دھاگا تک نہ ملا۔

"اچھا تم پریشان مت ہو۔ میں ہمسایوں کے گھر جا کر وہاں سے رسی لاتا ہوں" مشکا بزرگوں کی طرح بولا۔

"نہیں! تم نہیں جاؤ گے" میں نے کہا "ذرا وقت تو دیکھو، ہر کوئی اس سے بہت پہلے سو گیا ہوگا"۔



پہلے ہی ایک مصیبت کم نہ تھی کہ ہم دونوں کو پیاس بھی لگ گئی۔

مشکا بولا "یہ ہمیشہ ہی سے ہوتا آیا ہے کہ جب پانی پاس نہ ہو تو پیاس زیادہ لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ جب صحرا میں جاتے ہیں تو انہیں پیاس لگ جاتی ہے کیوں کہ وہاں پانی جو نہیں ہوتا"۔

"صحراؤں کے بارے میں مت سوچو، جاؤ اور جا کر رسی ڈھونڈو" میں نے اسے ڈانٹا۔

"کہاں ڈھونڈوں؟ پہلے ہی ہر جگہ سے ڈھونڈ لی ہے۔ چلو آؤ اب مچھلی پکڑنے والے کانٹے سے ہی کام چلا لیں" اس نے ایک ترکیب بتائی

"کیا اس کی ڈوری اتنی مضبوط ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ مضبوط ہے" وہ بولا۔

"اور اگر نہ ہوئی تو......؟"

"تو پھر ٹوٹ جائے گی"۔

ہم نے مچھلی پکڑنے والے کانٹے کی ڈوری اتاری، اسے کیتلی سے باندھا اور کنویں پہ چلے گئے۔ پھر میں نے کیتلی کنویں میں لٹکا دی۔ اس میں پانی بھر گیا اور ڈوری تن گئی۔

"یہ تو ٹوٹنے والی ہو رہی ہے"۔ میں نے کہا "دیکھ لینا ابھی ٹوٹ جائے گی"۔

"ٹوٹ کیوں جائے گی تم اس کو احتیاط سے نکالو"۔

میں اسے بڑی احتیاط سے نکال رہا تھا اور کیتلی باہر آنے ہی والی تھی کہ ایک زوردار چھناکا ہوا اور کیتلی غائب ہو گئی۔

"ڈوری ٹوٹ گئی؟" مشکا نے پوچھا۔

"ہاں اب پانی کیسے نکلے گا؟" میں گھبرا گیا۔
"کوئی اور برتن دیکھ لیتے ہیں مثلاً کوئی ایسا برتن جو گر بھی جائے تو ہمیں کوئی مسئلہ نہ ہو" وہ عقل مندی سے بولا۔
"ہمارے پاس اتنے برتن نہیں کہ کنویں میں پھینکتے جائیں" میں نے اسے گھورا۔
"تو ٹھیک ہے وہ جو گلاس ہے نا اسی سے نکال لیتے ہیں"۔
"یعنی ہم تھوڑا تھوڑا پانی نکالنے میں ساری رات لگا دیں؟"
"تو چلو پھر وہ جو پیتل کا بڑا مگ ہے اس سے نکال لیتے ہیں۔ وہ گلاس سے تو بڑا ہے نا"۔
پھر ہم دونوں واپس گھر گئے مچھلی پکڑنے والی ڈوری سے پیتل کا مگ باندھا اور پھر دوبارہ کنویں پر آ گئے۔
خدا خدا کر کے پانی نکالا اور دونوں نے باری باری پیا۔ پانی پی چکے تو مشکا بولا۔
"پتا ہے جب ہم پیاسے ہوتے ہیں تو لگتا ہے ہم سارا سمندر پی جائیں گے لیکن جب پانی پینا شروع کر دیتے ہیں تو ایک گلاس سے ہی پیاس بجھ جاتی ہے۔ یہ اس لیے ایسا ہوتا ہے کہ انسان فطری طور پر لالچی ہے"
مشکا اکثر مفکروں کی طرح بات کر دیتا تھا۔ میں ہمیشہ اسے ڈپٹ کر چپ کراتا تھا۔
"مشکا اب بھاگ کر گھر سے کوئی اور نسبتاً بڑا برتن لے آئیں تا کہ ہم کنویں سے پانی نکال نکال کر اس میں جمع کرتے جائیں اور ایک بار ہی پانی بھر کر لے جائیں۔ اس طرح بار بار آنے جانے کا وقت بچ جائے گا"
یہ سن کر مشکا بھاگتا ہوا گیا اور ایک برتن اٹھا لایا۔ پھر اس نے برتن کو کنویں کی منڈیر پر رکھ دیا۔ میں ڈوری کو کھینچتے ہوئے پیتل کے گلاس کو جو نہی پکڑنے لگا میری کہنی کنوئیں کی منڈیر پر پڑے برتن سے ٹکرائی۔
"ارے اسے یہاں سے اتار کر زمین پر رکھو تا کہ میں اس میں پانی ڈال سکوں۔ ورنہ یہ یہاں سے کنویں میں گر جائے گا"۔
مشکا نے اسے اتار کر زمین پر رکھا اور میں نے اس میں پانی ڈال دیا۔ میں کنویں سے پانی نکال نکال کر اس میں ڈالتا رہا۔ جب برتن پورا بھر گیا تو ہم دونوں اسے اٹھا کر گھر لے گئے۔ اس وقت تک ہمارا دلیا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ہم نے چولہا جلایا اور پتیلے کو اس پر رکھ دیا۔
بہت دیر بعد دلیا ابلنے لگ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ گاڑھا ہوتا گیا اور اس میں سے پٹاخوں جیسی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔
"سن رہے ہو؟" مشکا نے مجھ سے کہا "جلد ہی مزے دار دلیا تیار ہونے والا ہے"۔
میں نے تھوڑا سا دلیا چمچے میں لے کر ٹھنڈا کیا اور پھر منہ میں ڈال لیا۔ کیا بتاؤں کہ وہ کتنا بدمزہ تھا۔ انتہائی کڑوا اور جلا ہوا ذائقہ تھا۔ ہم اس میں نمک ڈالنا ہی بھول گئے تھے۔ مشکا نے بھی چکھا اور فوراً تھوک دیا۔
"نہیں" مشکا چلایا "میں بھوکا مر جاؤں گا مگر یہ گندا سا دلیا نہیں کھاؤں گا۔ تم بھی اسے کھا کر مر جاؤ گے" میں نے کہا۔
"لیکن اب کیا ہو گا؟" اس نے پوچھا۔ وہ رونے والا ہو رہا تھا۔



"مجھے کیا پتا" میں نے کہا۔

مشکا بولا "ہم بھی کتنے بھلکڑ ہیں۔ ہم مچھلیوں کو تو بھول ہی گئے"۔

"رات کے اس وقت ہم مچھلیاں پکانے سے تو رہے۔ اب تو صبح ہونے والی ہے" میں نے اسے وقت بتایا۔

"ہم مچھلیاں پکائیں گے نہیں بلکہ تلیں گے۔ دیکھ لینا اس میں صرف ایک منٹ لگے گا" مشکا پھر بولا۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ نہ ہو کہ دلیے جتنی دیر لگ جائے" میں اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو گیا۔

"نہیں بھئی، اگر زیادہ سے زیادہ وقت بھی لگا تو صرف 5 منٹ لگیں گے"

اس کی بات پر میں مطمئن ہو گیا۔ مشکا نے ننھی منی مچھلیاں صاف کیں اور فرائنگ پین کو گرم کیا اور پھر مچھلیاں اس میں ڈال دیں۔ فرائنگ پین بہت گرم تھا اور وہ بھی بغیر تیل کے۔ سو مچھلیاں اس کے پیندے سے چمٹ گئیں۔ میں نے فرائنگ پین کو کپڑے کے ساتھ پکڑا اور مشکا نے مچھلیاں کھینچ کھینچ کر ان کے گوشت کا ستیاناس کر دیا۔ "بھلا کوئی بغیر تیل کے بھی مچھلیاں تل سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

مشکا نے جلدی سے تیل کی بوتل پکڑی اور کنارے تک فرائنگ پین کو تیل سے بھر دیا جو ایک طرف سے چولہے پر گرنا شروع ہو گیا اور چولہے اور فرائنگ پین میں آگ لگ گئی۔ مشکا نے فرائنگ مین اتارنے کی کوشش میں اسے الٹ دیا۔ میں ادھر ادھر بھاگا تاکہ آگ پر پانی ڈال کر آگ بجھا سکوں۔ لیکن سارا پانی تو ہم نے دلیے میں استعمال کر لیا تھا۔ لہٰذا ہمیں ایک قطرہ بھی پانی نہ ملا اور تیل جل جل کر ختم ہو گیا۔ باورچی خانہ دھوئیں سے بھر گیا اور مچھلیاں جل کر کوئلہ ہو گئیں۔

"اب ہم کیا تلیں؟" مشکا مظلومیت سے بولا۔

"اب ہم کچھ بھی نہیں تلیں گے" میں تو پہلے ہی غصے سے بھرا بیٹھا تھا۔

"تم نہ صرف کھانا ضائع کرتے جاؤ گے بلکہ گھر بھی جلا ڈالو گے۔ آج کے لیے اتنی ہی سلیقہ مندی کافی ہے" میں نے چیخ کر کہا۔

"لیکن ہم کھائیں گے کیا؟" وہ بولا لیکن میں مارے غصے کے چپ رہا۔

پھر ہم نے تھوڑی دیر بعد کچی گندم کھانے کی کوشش کی لیکن اسے کھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اسے چھوڑ کر ہم کچے پیاز کھانے لگے لیکن وہ بہت کڑوے تھے۔ پھر ہم نے کوکنگ آئل پینے کی کوشش کی جس کا ذائقہ برداشت نہ کر سکے۔ آخر کار ہمیں گاجروں کے مربے کا مرتبان نظر آیا۔ جس میں نہ ہونے کے برابر مربہ تھا۔ ہم دونوں نے اسے تقریباً چاٹ کر صاف کر دیا اور سو گئے۔

صبح آنکھ کھلی تو ہم بھیڑیوں کی طرح بھوکے تھے۔ مشکا دلیہ پکانا چاہتا تھا لیکن جب میں نے اسے گندم نکال کر پھر ایک پتیلے میں ڈالتے دیکھا تو میں پھٹ پڑا۔

"خبردار! دلیا پکانے کی جرات نہ کرنا۔ میں اپنی ہمسائی آنٹی نتاشا کے پاس جاؤں گا اور ان سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے تمہارا دلیا کھانے سے بچا لیں"۔

پھر میں مشکا کو دھکیلتا ہوا آنٹی نتاشا کے گھر لے گیا اور انہیں ساری درد بھری کہانی سنائی اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ اگر ہمیں دلیا پکا کر دیں گی تو میں اور مشکا ان کے لان سے فالتو اور نقصان دہ جڑی بوٹیاں اکھاڑ کر صاف ستھرا کر دیں گے۔ انہیں ترس آ گیا اور انہوں نے ہمارے لیے مزے دار سا دلیا پکا دیا۔

ہم نے اتنا کھایا، اتنا کھایا کہ اٹھنا مشکل ہو گیا۔ آنٹی نتاشا کا سب سے چھوٹا بیٹا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ آخر کار جب کھا کھا کر پیٹ پھول گیا تو آنٹی نتاشا نے ہمیں ایک ہک اور رسی دی تاکہ ہم کنویں سے بالٹی اور کیتلی نکال سکیں۔ ہم کنویں پر گئے اور مت پوچھیں کہ ہم نے کس کس طرح سے کیتلی اور بالٹی کو باہر نکالنے کی کوشش کی۔ آخر کار ہم انہیں باہر نکالنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ وہاں سے آ کر میں نے، مشکا اور آنٹی نتاشا کے چھوٹے بیٹے نے مل جل کر آنٹی نتاشا کے لان کو فالتو اور نقصان دہ جڑی بوٹیوں سے صاف کرنا شروع کر دیا۔

مشکا بولا "جڑی بوٹیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اکھاڑنا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں کم از کم دلیا پکانے سے تو آسان ہی ہے" اور پھر بڑی معصومیت سے سر جھکا کر کام کرنے لگ گیا۔



چور پکڑا گیا

حسن ذکی کاظمی

سلیم منا اپنے کمرے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس تپائی کی طرف گئی جس پر وہ چاکلیٹ رکھ گیا تھا۔ خالی تپائی کو دیکھ کر اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہائیں! آج پھر چاکلیٹ غائب ہو گئی۔ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟"

وہ حیران و پریشان کرسی پر بیٹھ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ بات بھی حیرانی کی تھی۔ وہ اتنی اہم تحقیق کر رہا تھا کہ اسے سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی۔ دو چار منٹ کے لیے کسی ضروری کام سے باہر جاتا بھی تو کمرے کا تالا لگا کر جاتا۔ تالا بھی کمپیوٹرائزڈ تھا جو صرف اس وقت کھلتا تھا جب وہ اسے اپنے سیدھے ہاتھ کی اشارے والی انگلی سے چھوئے۔ کوئی اور اس تالے کو کھول ہی نہ سکتا تھا۔

سلیم منا ایک ایسے سائنسی ادارے میں کام کر رہا تھا جس میں دنیا کے مختلف ملکوں کے سائنس دان تحقیق میں مصروف تھے۔ اس ادارے کا سارا خرچ سائنس کا عالمی ادارہ برداشت کرتا تھا اور اس میں کام کرنے والے ہر سائنس دان کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جس چیز پر چاہیں تحقیق کریں۔ لیکن شرط یہ تھی کہ تحقیق انسانیت کی بھلائی کے لیے ہونا چاہیے۔

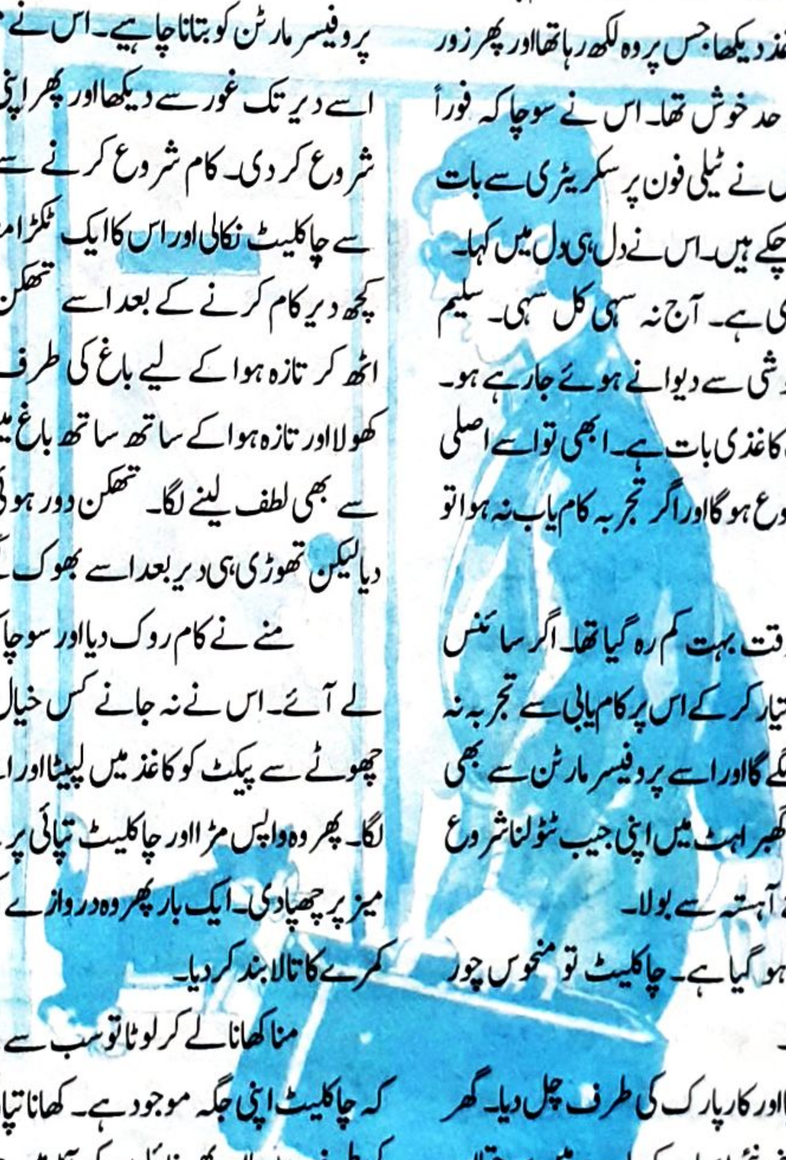
سلیم منا کا نام تو دراصل سلیم احمد تھا لیکن اسے گھر والے بچپن سے منا کہتے تھے۔ یہ عرفیت کسی طرح دفتر والوں کو معلوم ہو گئی۔ انہیں یہ چھوٹا سا نام ایسا بھایا کہ سب اسے منا کہنے لگے۔ منا بڑا ہونہار طالب علم رہا تھا اور اب تو اسے ملک کے بڑے سائنس دانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس بین الاقوامی ادارے کے چیئرمین پروفیسر لوئی مارٹن اس سے بہت محبت بھی کرتے تھے اور اس کی عزت بھی۔ کیوں کہ ادارے کی شہرت اور کامیابی میں اس کا بہت حصہ تھا۔

منا جس تحقیق میں مصروف تھا وہ اسے چند ہی ہفتوں میں مکمل کر کے سائنس کے عالمی میلے میں پیش کرنا تھی۔ ایک طرف سائنس میلے کی تیاریاں اور دوسری طرف تحقیق مکمل کرنے کی فکر۔ منے کے ذہن پر بہت دباؤ تھا لہٰذا اس نے سوچا کہ موڈ ٹھیک رکھنے کے لیے چاکلیٹ کھائی جائے۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ منے کو چاکلیٹ بہت پسند تھی اور اسے یہ بہانہ مل گیا کہ چاکلیٹ کھانے سے موڈ ٹھیک رہتا ہے اور دماغی پریشانی کم ہوتی ہے۔ وہ اپنی پسند کی ایک خاص چاکلیٹ روز خرید کر لاتا اور تھوڑی تھوڑی کھاتا رہتا۔

یہ دوسرا موقع تھا کہ اس کے بند کمرے سے تپائی پر رکھی ہوئی چاکلیٹ غائب ہوئی تھی۔ پہلی مرتبہ جب ایسا ہوا تو منے نے خود اپنے کو الزام دیا۔ اس نے سوچا کہ شاید اس نے خود ساری چاکلیٹ کھا لی ہے اور بھول گیا ہے۔ لیکن اب تو غلط فہمی یا بھول کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس بار تو وہ کمرے سے باہر جاتے وقت کوٹ کی جیب سے چاکلیٹ نکال کر تپائی پر رکھ گیا تھا۔ تازہ ہوا کی خاطر وہ باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا شیشہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔ وہ اٹھا اور کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس نے سوچا کہیں اس کمرے میں آسیب تو نہیں۔ پھر وہ خود ہی خود اپنے اس خیال پر شرمندہ ہو گیا۔ اس نے سوچا "میں بھی عجیب آدمی ہوں۔ کیسا آسیب" پھر اس نے سوچا "کیا چاکلیٹ پگھل کر ہوا میں گھل گئی؟" اپنے اس انوکھے خیال پر وہ خود ہی خود مسکرایا اور آہستہ سے بولا۔

"سلیم احمد منے! یہ بے وقوفی کی باتیں سوچنا بند کرو اور اپنے کام میں جت جاؤ...... سمجھے؟"

اس نے کھڑکی بند کی اور اپنی میز کے پاس بیٹھ کر کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ اپنی نئی تحقیق یا نئی ایجاد کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ سوچتا جاتا اور ایک کاغذ پر پنسل سے کچھ شکلیں بناتا جاتا، وہ کچھ بناتا، کچھ اشارے لکھتا اور پھر چھوٹے چھوٹے جملے لکھتا، کچھ دیر بعد وہ مسکرایا اور زور سے کہنے لگا "کام بن گیا"۔



دراصل منا اس ایجاد کے سلسلے میں کئی مہینے سے کام کر رہا تھا۔ کئی ہفتے ہوئے اس نے اپنا زیادہ تر کام کر لیا تھا۔ بس ذرا سا کام رہ گیا تھا لیکن یہ ذرا سا کام ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ ادھر کام ختم ہونے کے قریب ہوتا کہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی اور کام پھر ادھورا رہ جاتا۔ اب بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ منے نے سوچا آج وہ کام پورا کر کے ہی اٹھے گا چاہے کتنی دیر ہو جائے......اور آخر اس نے کام پورا کر ہی لیا۔ اس نے بڑے غور سے وہ کاغذ دیکھا جس پر وہ لکھ رہا تھا اور پھر زور سے ہنسا۔ وہ اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ اس نے سوچا کہ فوراً پروفیسر مارٹن کو اطلاع دے۔ اس نے ٹیلی فون پر سکریٹری سے بات کی تو معلوم ہوا کہ پروفیسر گھر جا چکے ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"چلو ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ آج نہ سہی کل سہی۔ سلیم منے تم تو بالکل بچے بن گئے۔ خوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے ہو۔ ابھی بہت کام ہے۔ یہ تو صرف کاغذی بات ہے۔ ابھی تو اسے اصلی شکل دینا ہے پھر اس کا تجربہ شروع ہوگا اور اگر تجربہ کامیاب نہ ہوا تو پھر؟"

منا ایک دم گھبرا گیا۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ اگر سائنس میلے سے پہلے پہلے وہ اپنی ایجاد کو تیار کر کے اس پر کامیابی سے تجربہ نہ کر سکا تو اس کی شہرت کو دھچکا لگے گا اور اسے پروفیسر مارٹن سے بھی سخت شرمندگی ہوگی۔ منے نے گھبراہٹ میں اپنی جیب ٹٹولنا شروع کی اور پھر سر پر ہاتھ مارتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"میرا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ چاکلیٹ تو منحوس چور لے گیا۔ جیب میں کیا رکھا ہے"۔

یہ کہہ کر وہ اٹھا کمرا بند کیا اور کار پارک کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچ کر بھی وہ سوچتا ہی رہا۔ کبھی اپنی نئی ایجاد کے بارے میں سوچتا اور خوش ہوتا۔ کبھی چاکلیٹ کی چوری پر غور کرتا اور الجھنے لگتا۔ رات کو دیر سے سویا اور صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ جلدی جلدی تیار ہوا اور گھر سے نکل پڑا۔ راستے میں اپنی پسند کی چاکلیٹ خریدی اور دفتر پہنچ گیا۔ کمرے کے قریب پہنچا تو پروفیسر مارٹن کی پالتو بلی لوسی نظر آئی۔ لوسی منے کو بہت اچھی لگتی تھی اور وہ بھی منے سے بہت مانوس تھی۔ خالی وقت میں منا اکثر اسے پیار کرتا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا تھا۔ منے کو دیکھ کر لوسی نے میاؤں میاؤں کر کے اسے خوش آمدید کہا۔ منا اپنے خیالوں میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اس نے لوسی کی طرف توجہ نہ دی اور دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ لوسی کو دیکھ کر منے کو یہ اندازہ ضرور ہوا کہ پروفیسر مارٹن دفتر میں موجود ہیں۔ اس نے سوچا کہ وہ جلدی سے انہیں اپنی کامیابی کی اطلاع دے دے۔ پھر خیال آیا کہ ایسی بھی کیا بے صبری، ابھی تو آدھی کامیابی ہوئی ہے۔ اس کی ایجاد اصلی شکل میں آ جائے اور وہ اس کا تجربہ کر لے تو پھر پروفیسر مارٹن کو بتانا چاہیے۔ اس نے میز پر رکھا ہوا کل والا کاغذ اٹھایا، اسے دیر تک غور سے دیکھا اور پھر اپنی ایجاد کردہ چیز بنانے کی تیاری شروع کر دی۔ کام شروع کرنے سے پہلے اس نے کوٹ کی جیب سے چاکلیٹ نکالی اور اس کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر مزے لینے لگا۔ کچھ دیر کام کرنے کے بعد اسے تھکن محسوس ہونے لگی۔ اس نے اٹھ کر تازہ ہوا کے لیے باغ کی طرف والی کھڑکی کا تھوڑا سا شیشہ کھولا اور تازہ ہوا کے ساتھ ساتھ باغ میں کھلے ہوئے حسین پھولوں سے بھی لطف لینے لگا۔ تھکن دور ہوئی تو اس نے پھر کام شروع کر دیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اسے بھوک لگنے لگی۔

منے نے کام روک دیا اور سوچا کہ کینٹین سے کچھ کھانے کو لے آئے۔ اس نے نہ جانے کس خیال سے بچی ہوئی چاکلیٹ کے چھوٹے سے پیکٹ کو کاغذ میں لپیٹا اور اسے تپائی پر رکھ کر باہر جانے لگا۔ پھر وہ واپس مڑا اور چاکلیٹ تپائی پر سے اٹھا کر فائلوں کی آڑ میں میز پر چھپا دی۔ ایک بار پھر وہ دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکل کر کمرے کا تالا بند کر دیا۔

منا کھانا لے کر لوٹا تو سب سے پہلے اس نے اطمینان کرنا چاہا کہ چاکلیٹ اپنی جگہ موجود ہے۔ کھانا تپائی پر رکھ کر وہ تیزی سے میز کی طرف بڑھا اور پھر فائلوں کی آڑ میں جھانکا۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی "ارے!!!"

وہ سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔

"یا اللہ! یہ ماجرا کیا ہے؟ کیا واقعی اس کمرے میں کسی بھوت کا سایہ ہے؟ یا کسی نے کمپیوٹرائزڈ تالے کو کھولنے کی کوئی ترکیب ایجاد کر لی ہے؟"

فائلوں کی آڑ میں رکھی ہوئی چاکلیٹ کاغذ اور ربڑ کے چھلے سمیت وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ اچانک منے کو یاد آیا کہ جس کاغذ



میں میں نے چاکلیٹ کا پیکٹ لپیٹا تھا وہ تو وہی تھا جس پر اس نے اپنی ایجاد کے بارے میں اشارے لکھے تھے۔ وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔ اسے یہ تو اطمینان تھا کہ نہ کوئی ان اشاروں کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اس کاغذ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اسے یہ پریشانی تھی کہ اسے پھر سے یہ کام کرنا پڑے گا اور یاد کر کر کے وہ شکلیں اور اشارے پھر بنانا ہوں گے جس میں اس کا کافی وقت لگ جائے گا۔ بہر حال یہ کام تو اسے کرنا ہی پڑے گا۔

منے نے سوچا کہ وہ چیئر مین کو چاکلیٹ کی چوری کے بارے میں بتائے کیوں کہ کہیں نہ کہیں گڑ بڑ ضرور ہے۔ آج چاکلیٹ غائب ہوئی ہے کل کوئی اہم اور خفیہ فائل غائب ہو سکتی ہے۔ ادارے کے قیمتی راز بھی چوری ہو سکتے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا کہ پروفیسر مارٹن کو ساری بات بتائے لیکن پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی چور کو پکڑے گا اور جلد پکڑے گا۔ وہ ذرا دیر آرام سے بیٹھ کر کھانا کھانا چاہتا تھا۔

منا مزے لے لے کر کھانا کھاتا رہا اور چور کو پکڑنے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ پریشانی کے بجائے اب اس کے چہرے پر اطمینان تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ کھانے کے بعد وہ کاغذ پنسل لے کر بیٹھ گیا اور پھر وہی کام کرنے لگا جو ایک دن پہلے اس نے کیا تھا۔ اس میں بہت دیر لگی اور جب یہ کام ختم ہوا تو وہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ اسے چاکلیٹ کی شدید خواہش ہو رہی تھی لیکن چاکلیٹ اب کہاں؟ وہ تو چور کے پیٹ میں جا چکی ہو گی۔ اس نے سوچا "عجیب چور ہے چاکلیٹ جیسی معمولی چیز چرانے کے لیے اتنا خطرہ مول لیتا ہے۔ چرانا ہی ہے تو کوئی قیمتی چیز چرائے...... بے وقوف کہیں کا" پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے آہستہ سے کہا۔

"اب بچ کر کہاں جاؤ گے برخوردار؟"

پھر وہ خود ہی خود ہنستا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکل کر تالا بند کر دیا۔ اس نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا کیوں کہ وہ اب اور کام کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

ایک ہفتے تک منے نے اتنا کام کیا کہ اسے خود اپنا ہوش نہ رہا۔ چاکلیٹ ان دنوں میں چوری نہ ہوئی کیوں کہ وہ اسے جیب میں رکھتا تھا۔ ہفتہ گزر جانے کے بعد منے کی مصروفیت کچھ کم تو ہو گئی لیکن ختم نہیں ہوئی۔ وہ کام میں لگا رہا اور آخر اس نے وہ آلہ تیار کر لیا جس کی تیاری کا خواب وہ سال بھر سے دیکھ رہا تھا۔ اب اس آلے کی آزمائش کا وقت آ گیا تھا۔ منے نے اپنی ایجاد کو غور سے دیکھا اور رکھ دیا۔ پھر اس نے جیب سے چاکلیٹ نکالی جو جیب میں رکھے رکھے ٹوٹ بھی گئی تھی اور نرم بھی ہو گئی تھی۔ اس نے چاکلیٹ کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور باقی چاکلیٹ اس خیال سے تپائی پر رکھ دی کہ کہیں اور نہ پگھل جائے اور کپڑے نہ خراب ہوں۔ پھر اسے کچھ خیال آیا اور تپائی کو کھڑکی کے قریب رکھ کر اس نے تھوڑی سی کھڑکی کھول دی تا کہ تازہ اور ٹھنڈی ہوا سے چاکلیٹ کی حالت ٹھیک ہو جائے۔



منا اپنا کمرا بند کر کے تھوڑی دیر کے لیے کینٹین کی طرف گیا تا کہ کافی پی لے اور چند دوستوں سے بھی ملاقات ہو جائے۔ وہ کئی ہفتوں سے اتنا مصروف رہا تھا کہ کافی کے وقفے میں کینٹین جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ دوستوں اور ساتھیوں سے آتے جاتے دور ہی دور سے ہیلو ہیلو ہو جاتی تھی۔ آج فرصت ملی تو دوست اور ساتھی یاد آئے۔

کافی پی کر منا کمرے میں آیا تو ایک بار پھر حیران ہو گیا۔ چاکلیٹ کا پیکٹ تپائی پر سے غائب تھا۔ البتہ ایک چھوٹا سا ٹکڑا ٹوٹ کر تپائی پر رہ گیا تھا۔ منے نے وہ ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"مہربان چور! آپ کا شکریہ کہ ایک ٹکڑا تو میرے لیے چھوڑ گئے"۔ پھر وہ صوفے پر بیٹھ کر کچھ سوچتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریموٹ کنٹرول تھا جس کا بٹن اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دبایا تھا۔ اس نے ریموٹ کنٹرول کو بہت غور سے دیکھا اور کافی دیر

تک اسے اوپر نیچے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد اس کا رخ تپائی کی طرف کیا اور ایک دوسرا بٹن دبا دیا۔ پھر اس نے ریموٹ کنٹرول کو جیب میں ڈال لیا اور خود اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے سے نکل کر وہ پروفیسر مارٹن کے کمرے کی طرف روانہ ہوا تاکہ انہیں اپنی کارگزاری کی تفصیل بتا سکے۔ اس کی نئی ایجاد ایک چھوٹا سا آلہ تھا جو اس وقت اس کے ہاتھ میں تھا۔

منا خوشی خوشی پروفیسر مارٹن کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت بالکل فارغ بیٹھے تھے اور گود میں بیٹھی ہوئی لوسی کے بالوں میں بڑے پیار سے ہاتھ پھیر رہے تھے۔ منا ان کے قریب گیا اور ہاتھ ملا کر بات شروع کرنے ہی والا تھا کہ اچانک دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے آلے کا ننھا سا بلب جلنے بجھنے لگا اور اس میں ایسی سنسناہٹ پیدا ہوئی جو اسے اپنے ہاتھ میں محسوس ہوئی۔ وہ حیرت سے کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"یہ ناممکن ہے۔"

پروفیسر مارٹن کچھ پریشان ہو کر بولے۔ "کیا ناممکن ہے؟"

منا ان کے اس سوال سے بوکھلا گیا۔ وہ چند سکنڈ خاموش رہا اور پھر اس نے بات بنائی۔ "میرا مطلب ہے...... یہ ناممکن ہے کہ...... یعنی یہ کہ آپ اس طرح کبھی فرصت سے بھی بیٹھ سکتے ہیں، یقین نہیں آتا۔"

"ہاں ہاں! تم نے درست کہا" پروفیسر مارٹن تھوڑا ہنستے ہوئے بولے "دراصل سر میں کچھ درد محسوس کر رہا تھا، ابھی گولی کھائی ہے سوچا ذرا آرام کر لوں، ہاں تم بتاؤ کیسے آئے؟"

منے نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس وقت وہ پروفیسر کو کچھ نہیں بتائے گا۔ وہ سخت پریشان ہو گیا تھا۔ اسے بار بار خیال آرہا تھا کہ کیا پروفیسر مارٹن ایسی حرکت بھی کر سکتے ہیں؟ چاکلیٹ جیسی معمولی چیز کی چوری! یہ کیسے ممکن ہے؟ لیکن ہو سکتا ہے وہ کچھ اور تلاش کر رہے ہوں اور میری توجہ اصل بات سے ہٹانے کے لیے چاکلیٹ غائب کر دیتے ہوں۔ پتا نہیں میرے تحقیقی کام کی فائلیں اور نقشے اپنی جگہ پر ہیں یا غائب کر لیے گئے ہیں۔ میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں اور ہاں یہ کمپیوٹرائزڈ تالا بھی تو پروفیسر مارٹن ہی نے میرے کمرے میں لگوایا تھا۔ ہو سکتا ہے انہیں اسے کھولنے کی کوئی ترکیب معلوم ہو۔ منا سوچے جا رہا تھا...... سوچے جا رہا تھا کہ اسے پروفیسر کی آواز نے چونکا دیا۔

"کہاں غائب ہو گئے؟ معلوم ہوتا ہے تم بھی میری طرح سر درد میں مبتلا ہو، خیریت تو ہے؟"

سلیم منے نے نقلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ نے ٹھیک پہچانا۔ سر درد بھی ہے اور تھکن بھی، اچھا اجازت دیجیے۔"

پروفیسر مارٹن نے لوسی کو گود سے اتار کر فرش پر چھوڑ دیا اور اٹھ کر منے کو دروازے تک پہنچانے آئے۔ وہ منے کو رخصت کرنے لگے تو اس نے کسی بہانے سے وہ آلہ ان کے قریب کر دیا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بار نہ بلب جلا بجھا اور نہ اسے سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ وہ دروازے کے قریب رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا اور پھر سوچنا شروع کر دیا۔ پروفیسر مارٹن پریشان ہو گئے۔ وہ سمجھے کہ منے کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ انہوں نے جلدی سے اسے پانی کا گلاس دیا اور خیریت پوچھی۔ منے نے جواب دیا۔ "تجربہ ناکام ہو گیا۔ آلہ ٹھیک کام نہیں کر رہا۔ کچھ گڑبڑ ہے"

پروفیسر نے کچھ حیرت اور کچھ پریشانی سے پوچھا۔ "تجربہ



ناکام ہو گیا؟ کیسا تجربہ؟ کیسا آلہ؟ کیا گڑبڑ ہے؟ پہیلی نہ بجھاؤ کھل کر بات کرو"۔

منے نے پروفیسر کی باتوں پر توجہ نہ دی اور بولتا رہا۔

"کسی نے آلے میں گڑبڑ کردی۔ اب ہو گا کیا؟ وقت بہت کم ہے"

پروفیسر مارٹن کو یقین ہو گیا کہ گڑبڑ دراصل منے کے دماغ میں ہے۔ وہ جلدی سے دروازہ کھول کر برابر والے کمرے میں گئے تاکہ اپنی سکریٹری سے مشورہ کر سکیں۔ دو تین منٹ بعد وہ پھر اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں محسوس ہوا جیسے منے کا دماغی دورہ شدید ہو گیا تھا۔ وہ زور زور سے کہہ رہا تھا۔ "چور پکڑا گیا! ہاہاہا!! بلب جل گیا! سنسناہٹ بھی ہے 'چور پکڑا گیا'"۔

پروفیسر مارٹن تو خوف زدہ ہو ہی رہے تھے لیکن منے کی گود میں بیٹھی ہوئی لوسی بھی جیسے اس کی ان باتوں سے ڈر گئی ہو۔ وہ جلدی سے اس کی گود سے کودی اور تازہ ہوا کے لیے تھوڑی سی کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر نکل گئی۔ چند منٹ کمرے میں خاموشی رہی اور پھر منے نے پروفیسر کو ساری داستان سنائی۔ ہنستے ہنستے پروفیسر مارٹن کا برا حال ہو گیا۔ وہ ہنستے جاتے اور کہتے جاتے "یار یہ لوسی تو کمال کی ذہین ہے۔ میں خود حیران تھا کہ کچھ دن سے اس میں سے چاکلیٹ کی خوش بو کیسے آنے لگی۔ بھئی یقین جانو منے! میں نے اسے یہ ہرگز نہیں سکھایا"۔

پھر انہوں نے ہنسی کو ضبط کیا اور بولے "لوسی کی کارستانی تو تم نے سنادی اب ذرا چور پکڑنے والے آلے کے بارے میں تو کچھ بتاؤ"۔

منے نے بتانا شروع کیا "آپ کو یاد ہو گا کہ آج سے چار سال پہلے 2000ء میں برطانیہ کے ایک شعبہ نے سائنس دانوں کی ایک جماعت کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ وہ ایسے طریقے دریافت کریں اور ایسے آلے بنائیں جن کے ذریعے اکیسویں صدی میں مجرموں کو پکڑا جا سکے اور جرائم کو کم کیا جا سکے۔ ان سائنس دانوں نے بہت سی تجویزیں پیش کیں۔ ان میں ایک تجویز یہ تھی کہ ایک ایسا آلہ تیار ہو جسے چھپا کر اس جگہ لگا دیا جائے جہاں قیمتی چیزیں رکھی جاتی ہوں۔ جب کوئی شخص چوری کی کوشش کرے گا تو اس کے جسم کی جو خاص بو ہے وہ اس آلے میں بس جائے گی اور محفوظ رہے گی۔ جب کبھی یہ آلہ جسے میں نے "بوشناس" کا نام دیا ہے ایسے لوگوں کے پاس پہنچے گا جن پر شبہ ہے یا اتفاق سے اس شخص کے نزدیک آ جائے گا جو مجرم ہے تو آلہ محفوظ کی ہوئی بو کا مجرم کے جسم کی بو سے موازنہ کر کے اسے پکڑوا دے گا۔

میں نے یہ رپورٹ پڑھی تو سوچا کہ میں اس تجویز کو حقیقت میں بدل دوں۔ کافی محنت کے بعد میں نے یہ بوشناس آلہ تیار کر لیا۔ یہ ریموٹ کنٹرول سے کام کرتا ہے۔ یعنی اس جگہ کو تالا لگاتے وقت جہاں قیمتی چیز رکھی ہو دور سے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے آلے کو چلا دیں تاکہ خود آپ کی بو اس میں نہ بسے۔ پھر جب بھی اس جگہ واپس آئیں تو دروازہ کھولتے ہی ریموٹ کنٹرول سے آلہ بند کر دیں۔ اگر کوئی چور آیا ہو گا تو اس کی بو اس میں محفوظ ہو گئی ہو گی۔ اب اگر آپ یہ آلہ ساتھ لیے ہوئے ہوں اور چور سے آمنا سامنا ہو جائے تو یہ اس کی بو پہچانتے ہی خود بخود کام شروع کر دے گا یعنی "آن" ہو جائے گا۔ اس کا یہ ننھا سا بلب جلے بجھے گا اور ہلکی ہلکی سنسناہٹ محسوس ہو گی۔ اس طرح چور پکڑا جائے گا۔ ابھی تو میں نے تجربے کے لیے بوشناس کی ابتدائی شکل تیار کی تھی چوں کہ تجربہ کامیاب ہو گیا لہٰذا اب آپ کے مشورے سے اسے بہتر بناؤں گا تاکہ یہ سراغ رسانی کرنے والوں اور پولیس کے کام آ سکے"۔

پروفیسر مارٹن نے میز پر زور سے مکا مارا اور بولے۔ "ونڈر فل! ہم دونوں مل کر اسے بہتر بنائیں گے۔ تمہیں یہ کامیابی مبارک ہو لیکن دیکھو اب کمرے سے باہر جاتے وقت کھڑکی بند کرنا نہ بھولنا"۔

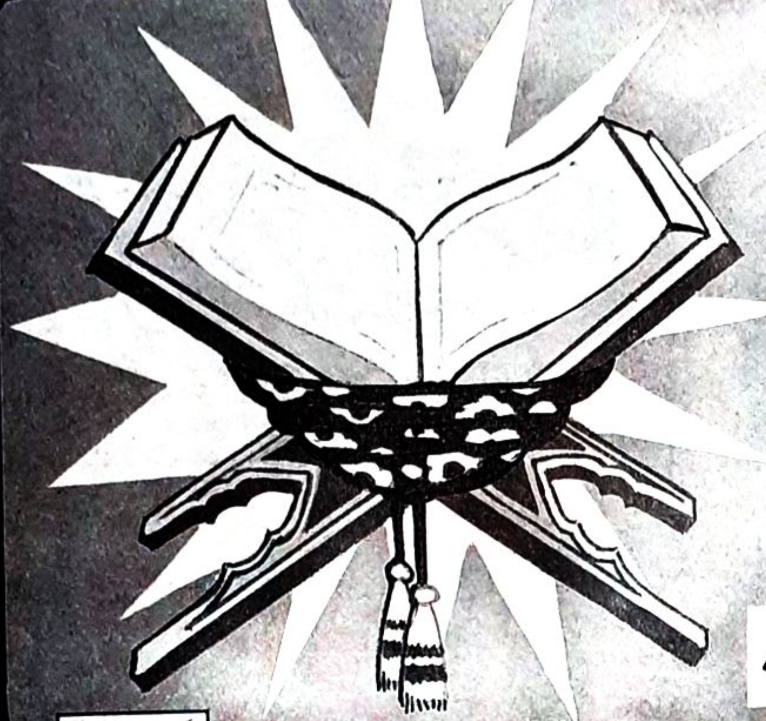
منے اور پروفیسر نے مل کر قہقہہ لگایا۔ منے نے جیب سے چاکلیٹ نکال کر ایک ٹکڑا خود کھایا اور دوسرا پروفیسر مارٹن کو پیش کیا۔ پروفیسر پھر زور سے ہنسے اور بولے۔ "میرے حصے کی چاکلیٹ لوسی کو کھلا دو"۔

منے نے باقی چاکلیٹ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے بلی چاکلیٹ کھاتی ہی نہیں۔ پتا نہیں لوسی یہ چاکلیٹ کھاتی تھی یا پھینک دیتی تھی۔ شاید اسے چاکلیٹ کی خوش بو پسند ہو"۔

بچوں کے لیے

درس قرآن



والدین کی خدمت کی ضرورت اور فائدے

ڈاکٹر عبدالرؤف

بچوں کے لیے درس قرآن میں آج ہمارا موضوع ہے "والدین کی خدمت کی ضرورت اور فائدے"۔

اس اہم موضوع کا ذکر پارہ نمبر 21 کی سورہ نمبر 31 کی آیت نمبر 15 کے ان درمیانی الفاظ میں ہوا ہے۔

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا

ترجمہ: دنیا میں ان دونوں کا اچھی طرح ساتھ دو!

جنت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے' یعنی ماں کی خدمت کا مقام اور معاوضہ بہت بلند ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ باپ کی خدمت کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اسلام میں ماں اور باپ دونوں کی خدمت اور اطاعت پر زور دیا گیا ہے۔

والدین کی خدمت اور فرماں برداری بچوں کی سعادت کا کمال ہے۔ والدین ہمیشہ بچوں کو نیکی او. بھلائی کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ ان کی مفید نصیحتوں اور ہدایتوں سے بچوں کو بے پناہ فائدہ ہوتا ہے۔ والدین کی ابتدائی راہ نمائی ہی سے بچوں کو کھرے کھوٹے اور برے بھلے کی تمیز ہوتی ہے۔ ان کے کردار میں اچھائی اور شخصیت میں وقار کی راہیں کھلتی ہیں۔ ان کی روز مرہ زندگی طرح طرح کی پھسلنوں' قباحتوں اور خطروں سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول سے پورا پورا لطف اور فائدہ اٹھانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

بچوں کی پرورش اور نگہ داشت میں والدین طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتے رہتے ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں چھوٹی بڑی قربانیوں سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے بھی والدین کی خدمت اور اطاعت ہر بچے پر فرض ہو جاتی ہے۔ والدین کی خدمت کی ضرورت اس وقت اور زیادہ اہم ہو جاتی ہے جب وہ بیمار ہوتے ہیں یا بڑھاپے کو پہنچ جاتے ہیں۔ اس سورت میں خصوصاً بچوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی اپنی ہمت کے مطابق بوڑھے اور بیمار والدین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں۔



حقیقی خوشی

نجمہ معراج

اسکول میں آج یوم والدین تھا۔ سب بچوں نے اپنے والدین کے ساتھ آنا تھا۔ اسد نے آج ایک تقریری مقابلے میں حصہ لینا تھا۔ تقریر کا موضوع تھا "ماں کی عظمت" اس موضوع پر اس نے بڑی محنت سے تقریر تیار کی تھی۔

ہال میں ایک طرف اسٹیج بنا ہوا تھا اور اسٹیج کے سامنے دور تک اسکول کا ہال ایک جیسی کرسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ چھوٹی جماعتوں کے بچے ایک جیسا خوب صورت لباس پہنے چھوٹے چھوٹے بینر اٹھائے ہوئے تھے۔ ان بینرز پر والدین کے احترام کے بارے میں مختلف جملے لکھے ہوئے تھے۔

پروگرام کا آغاز قرآن حکیم کی تلاوت سے ہوا۔ پھر اسٹیج سکریٹری نے معزز مہمانوں کا تعارف کرایا اور باری باری انہیں اسٹیج پر بلایا۔ وہ تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر جلوہ افروز ہو گئے تو جیوری کا اعلان ہوا۔ اس جیوری نے تقریری مقابلے میں حصہ لینے والوں میں سے تین افراد کے اول دوم اور سوم آنے کا تعین کرنا تھا۔

تقریری مقابلہ شروع ہوا۔ بہت سی شعلہ بیان تقاریر ہوئیں۔ سب سے آخری تقریر اسد کی تھی۔ اسد کو سب حصہ لینے والوں سے زیادہ داد ملی۔ اب سب اس بات کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے کہ اول انعام کس کو ملے گا۔ سب کی نظریں چیف جج کی طرف بے تابی سے دیکھ رہی تھیں اور وہ اپنے معاون جج صاحبان کے ساتھ بڑی تیزی سے جمع تفریق کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

اسد تقریر کرنے کے لیے اسٹیج کی طرف جا رہا تھا تو اس کے دوست نے پوچھا تھا کہ آپ کی والدہ کیوں نہیں آئیں۔ اسد نے تقریر کرنے کی جلدی میں اٹھتے ہوئے کہا تھا "وہ بیمار ہیں اس لیے"۔ اسد نے بہت اچھی تقریر کی تھی۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

"صاحب صدر و معزز خواتین و حضرات، ماں ایک عظیم ہستی ہے، ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ ماں کے بغیر یہ کائنات ادھوری ہے۔ ماں اپنے بچے کو پروان چڑھانے کے لیے کیا کیا مصیبتیں برداشت کرتی ہے اس کا اندازہ صرف ایک ماں ہی کو ہو سکتا ہے۔ ماں ہمیں اچھے برے کی تمیز سکھاتی ہے۔ جب ماں نہیں

ہوتی تو تب ماں کی قدر ہوتی ہے۔ ماں کا نعم البدل دنیا میں نہ کوئی ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ ماں سے ہی گھر گھر لگتا ہے"۔

پھر اسد نے پوری شعلہ بیانی کے ساتھ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا تھا:

"حاضرین مجلس، ہمیں ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے اور اس حسن سلوک کی توفیق کو دونوں جہان کی سعادت سمجھنا چاہیے۔ خدا کے بعد انسان پر سب سے زیادہ حق ماں باپ ہی کا ہے۔ ماں باپ کے حق کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ قرآن پاک نے جگہ جگہ ماں باپ کے حق کو خدا کے حق کے ساتھ بیان کیا ہے اور خدا کی شکر گزاری کی تاکید کے ساتھ ساتھ ماں باپ کی شکر گزاری کی تاکید کی ہے۔

پھر اسد نے اپنی گفت کا انداز بدلتے ہوئے ذرا دھیمے انداز میں کہا تھا۔

"صاحب صدر اور حاضرین مجلس، ذرا اس واقعہ کی طرف غور کیجئے کہ ایک دفعہ ایک آدمی نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے "میں آپؐ کے ہاتھ پر ہجرت اور جہاد کے لیے بیعت کرتا ہوں اور خدا سے اس کا اجر چاہتا ہوں"۔ نبیؐ پوچھتے ہیں "کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی ایک زندہ ہے؟" وہ کہتا ہے "جی ہاں، بلکہ خدا کا شکر ہے دونوں زندہ ہیں"۔ آپؐ فرماتے ہیں "تو کیا تم واقعی خدا سے اپنی ہجرت اور جہاد کا بدلہ چاہتے ہو؟" "جی ہاں (میں خدا سے اجر چاہتا ہوں)" نبیؐ ارشاد فرماتے ہیں "تو جاؤ اپنے ماں باپ کی خدمت میں رہ کر ان کے ساتھ نیک سلوک کرو"۔

پھر سیرت النبیؐ میں سے ہی ایک اور واقعہ اسد نے یوں بیان کیا تھا:

"صدر ذی وقار، ایک بار ایک شخص نے نبیؐ سے پوچھا "یا رسول اللہ! ماں باپ کا اولاد پر کیا حق ہے؟" ارشاد فرمایا "ماں باپ ہی تمہاری جنت ہیں اور ماں باپ ہی دوزخ"۔

یعنی ان کے ساتھ نیک سلوک کر کے تم جنت کے مستحق ہو گے اور ان کے حقوق پامال کر کے جہنم کا ایندھن بنو گے۔

پھر اسد نے سمجھانے کے انداز میں کہا "عزیز ساتھیو والدین کے شکر گزار رہئے کیوں کہ وہ اس دنیا پر ہمارے سب سے عظیم محسن ہیں۔ والدین ہی کی پرورش اور نگرانی میں ہم پلتے بڑھتے اور شعور کو پہنچتے ہیں اور وہ جس غیر معمولی قربانی، بے مثل جاں فشانی اور انتہائی شفقت سے ہماری سرپرستی فرماتے ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ ہمارا سینہ ان کی عقیدت و احسان مندی اور عظمت و محبت سے سرشار ہو اور ہمارے دل کا ریشہ ریشہ ان کا شکر گزار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے اپنی شکر گزاری کے ساتھ ساتھ ان کی شکر گزاری کی تاکید فرمائی ہے۔

حاضرین مجلس، والدین کے احترام کا عملی نمونہ دیکھنا ہے تو نبی مہربانؐ کے روشن ستاروں کا معاشرہ دیکھئے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے ایک بار دو آدمیوں کو دیکھا۔ ایک سے پوچھا "یہ دوسرے تمہارے ساتھ کون ہیں؟" اس نے کہا "یہ میرے والد ہیں"۔ آپؓ نے فرمایا "دیکھو نہ ان کا نام لینا نہ کبھی ان سے آگے آگے چلنا اور نہ کبھی ان سے پہلے بیٹھنا"۔

جونہی اسد کی تقریر ختم ہوئی ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ پھر کھچا کھچ بھرے ہال کی توقع کے مطابق اسد ہی اول انعام کا حق دار ٹھہرا۔ اور پھر وہ خوشی خوشی اپنی شیلڈ لے کر گھر پہنچا۔



اگلے روز اسد کا ایک ہم جماعت زوہیب اس سے ملنے اس کے گھر آیا۔ زوہیب کا گھر کافی دور تھا مگر وہ اسد کو بڑے اشتیاق سے مبارک باد کہنے آیا تھا۔ اسد کا گھر کچھ اس طرح بنا ہوا تھا کہ جب کوئی گیٹ سے اندر داخل ہوتا تو سب سے پہلے ڈرائنگ روم میں آتا۔ اس کے ساتھ صحن اور اس سے آگے برآمدہ اور برآمدے کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ اس بڑے سے گھر میں وہ دونوں ماں بیٹا ہی رہتے تھے۔ زوہیب نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اسد کو انعام جیتنے پر مبارک باد کہا۔ پھر سامنے پڑی شیلڈ کو غور سے دیکھنے لگا جو اسے والدین کے احترام کے موضوع پر تقریر کرنے پر ملی تھی۔ اسد نے زوہیب کو بیٹھنے کے لیے کہا اور خود قریب پڑی فرج میں سے ٹھنڈا جوس نکال کر زوہیب کو پیش کیا۔ ابھی اس نے دو ہی گھونٹ پیے ہوں گے کہ گھر سے ایک نحیف سی آواز آئی: "اسد بیٹا ایک گلاس پانی پلا دو"

یہ کسی بیمار خاتون کی آواز لگ رہی تھی۔ اسد کرخت لہجے میں بولا۔ "آپ کو پتا نہیں اماں میرے مہمان آئے ہوئے ہیں"۔

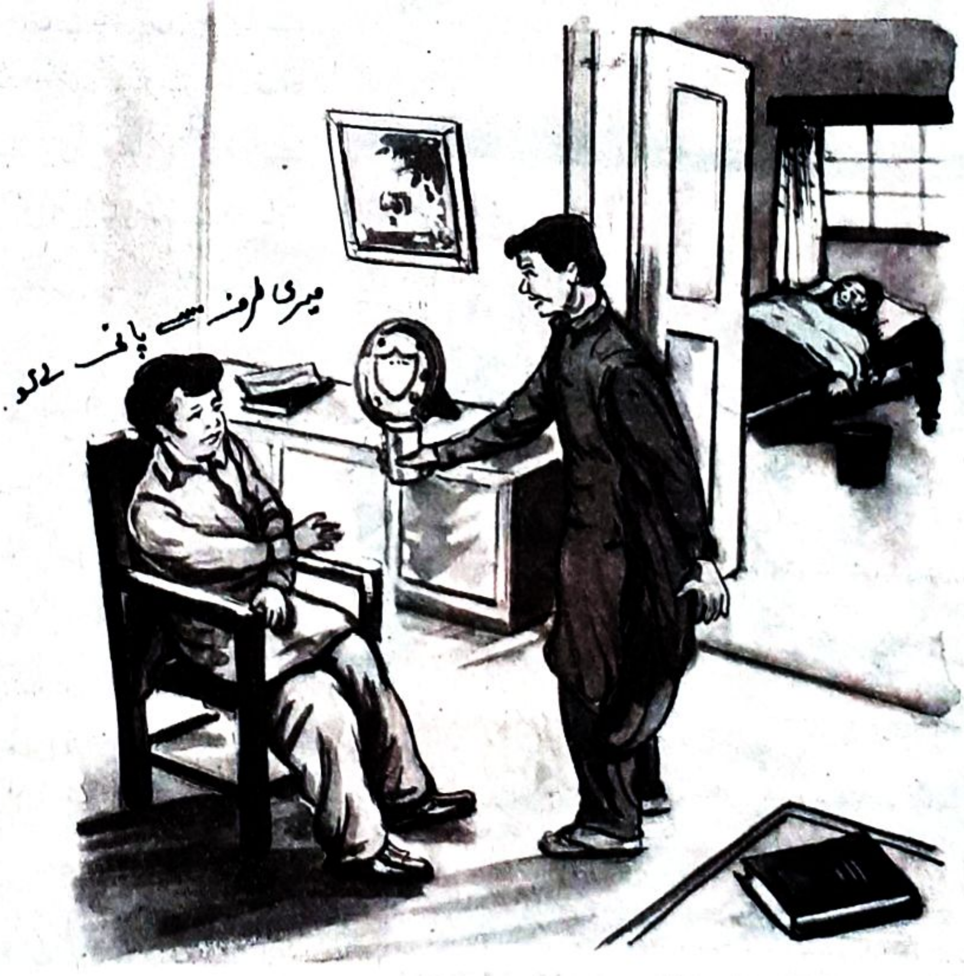
زوہیب بولا "یہ شاید آپ کی والدہ پانی مانگ رہی ہیں؟"

"چھوڑو یار، کوئی اور بات کرو۔ اماں ہی ہے۔ بس ایسے ہی بولتی رہتی ہے"۔

زوہیب حیران ہو کر جذباتی انداز میں بولا "اسد یار، تمہاری زندگی بھی کیسی دورنگی ہے؟ تمہارے قول و فعل میں کتنا تضاد ہے؟ تقریر میں تم نے ماں کی خدمت اور عظمت کے حوالے سے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے لیکن کیا یہ سب کچھ صرف ایک شیلڈ کی خاطر؟ کیا تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ ان لوگوں کو کس قدر شدید عذاب ہوگا جو کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ تم یہ شیلڈ پھینک دو، سب سے بڑا اعزاز تو آپ کے لیے یہ ہونا چاہیے کہ آپ اپنی والدہ کی خدمت کریں۔ اگر آپ کی ماں کی یہ حالت تھی تو آپ کو تقریر کرنے ہی نہیں جانا چاہیے تھا"۔

یہ سب باتیں سننے کے بعد اسد نے زوہیب سے کہا "بھائی آپ دو منٹ بیٹھیں میں ابھی اندر سے ہو کر آتا ہوں"۔

"چلیں میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ میں نے بھی تو خالہ جان کی عیادت کرنی ہے" زوہیب نے کہا اور پھر وہ دونوں ڈرائنگ روم سے نکل کر اس کمرے میں چلے گئے جہاں اسد کی والدہ تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ زوہیب پانی لے کر آیا اور دوائی پلانے لگ گیا جب کہ اسد بڑے مؤدب انداز میں اپنی امی جان کے پاؤں دابنے لگا۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ اسے آج پاؤں دبانے میں جو خوشی محسوس ہو رہی تھی اتنی اسے تالیوں کی گونج میں شیلڈ لیتے ہوئے بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔





ضمیر کا قیدی



زبیدہ سلطانہ

ندیم اور شوکت بچپن کے دوست تھے۔ ایک ہی محلے میں پلے بڑھے۔ محنت کش ماں باپ کی اولاد تھے اس لیے تعلیم بھی زیادہ نہ پا سکے۔ والدین کو بھی اپنے بچوں کو زیادہ پڑھانے کا شوق نہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ”مزدور کا بیٹا مزدور ہی بنے گا!“

ندیم اور شوکت نے آٹھویں جماعت پاس کی تو انہیں بھی ایک لوہا ڈھالنے کی فیکٹری میں نوکر کروا دیا گیا۔ ماں باپ خوش ہوئے کہ گھر کی آمدنی بڑھ گئی' بیٹے کمانے لگ گئے!

دونوں دوست صبح سویرے اٹھ کر اکٹھے کام پر جاتے اکٹھے واپس آتے۔ ایسے ہی کئی سال گزر گئے۔ ندیم اور شوکت اب جوان ہو گئے تھے۔ وہ صبح سویرے اٹھتے تین چار میل روزانہ پیدل چلتے۔ محنت مشقت کی عادت نے انہیں خوب تن درست و توانا بنا دیا تھا۔ دیانت داری اور لگن سے کام کرنے کی وجہ سے فیکٹری کا مالک انہیں اچھا سمجھتا تھا۔ اسی لیے ان کی ترقی بھی ہو گئی تھی۔

ایک دن روزمرہ کے معمول کے مطابق ندیم اور شوکت اندھیرے منہ فیکٹری کی طرف چلے جا رہے تھے کہ انہیں راستے میں ایک اٹیچی کیس پڑا ہوا ملا جو بہت وزنی تھا۔ کھولا تو وہ سونے سے بھرا ہوا تھا۔ دیکھ کر پہلے تو دونوں کے ہوش و حواس قائم نہ رہے۔ پھر اپنے آپ کو سنبھال کر انہوں نے سوچا کہ آدھا آدھا بانٹ لیتے ہیں۔ مگر شوکت کہنے لگا ”اسے کچھ عرصہ کہیں چھپا دیتے ہیں۔ اگر اس کے اصل مالک کا پتا چل گیا تو اسے واپس کر دیں گے۔ اس عرصہ میں کوئی وارث نہ ملا تو یہ سونا ہمارا ہوگا۔ اس طرح ہمیں کسی کی چیز ہتھیانے پر گناہ بھی نہیں ہوگا اور یہ مال ہم پر حلال ہو جائے گا“۔

ندیم کو اپنے دوست کی اس بات سے اتفاق کرنا پڑا۔ اگرچہ وہ دل سے اس فیصلے پر خوش نہیں تھا۔

انہوں نے راستے میں ایک پرانی عمارت کے کھنڈر میں اس بکس کو دفن کر دیا اور کام پر چلے گئے۔ شوکت اپنے اس فیصلے پر مطمئن تھا مگر ندیم کے دل میں کچھ فتور اٹھنے لگا تھا۔ وہ کچھ گم سم ہو گیا اور طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن کو پریشان کرنے لگے۔

کبھی وہ سوچتا شوکت اس کے ساتھ کوئی چالاکی کرنا چاہتا ہے' کبھی سوچتا ایسا نہ ہو اپنی اس دیانت داری کے پردے میں شوکت اسے دھوکا دینا چاہتا ہو۔ اسی طرح تین چار دن گزر گئے تو ندیم نے شوکت سے کہا کہ اب انہیں وہ سونا بانٹ لینا چاہیے۔

”راستے میں پڑی ہوئی چیز ہم پر حلال ہے۔ ہم نے کوئی چوری تو نہیں کی!“ اس نے شوکت کے سامنے جواز پیش کیا۔

”چلو جہاں ہم نے چار دن صبر کیا وہاں چھ دن اور سہی۔ ہم نے دس دن کی معیاد مقرر کی تھی۔ اتنی بے صبری بھی کیا ہے“۔ شوکت نے ہنس کر جواب دیا۔ ندیم برا سا منہ بنا کر چپ ہو رہا۔ وہ فیکٹری پہنچے ہی تھے کہ مالک نے انہیں بتایا کہ انہیں تین چار دن اوور ٹائم لگانا ہوگا۔ ”شہر کے ایک زیر تعمیر گرجے کا بہت ”ارجنٹ“ کام آیا ہے۔ گرجے میں نصب کرنے کے لیے ایک بڑے سائز کا گھنٹا بنانا ہے۔ اسے ڈھالنے کے لیے سب سے

بڑی بھٹی لگائی جائے گی''۔

فیکٹری کا سارا عملہ وہی گھنٹا بنانے کے کام میں لگ گیا۔ کچھ لوگ بھٹی پکانے لگے کچھ لوہا اٹھا اٹھا کر لانے لگے۔ ندیم کچھ عجیب قسم کی بیزاری اور سستی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا کام میں بالکل دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لاکھوں کی دولت کا مالک ہوتے ہوئے اسے یہ لوہا ڈھونا پڑ رہا ہے۔ حال آں کہ وہ اس گھٹیا نوکری کو چھوڑ کر عیش و آرام کی زندگی گزارنے پر قادر ہے اور یہ سب شوکت کی حماقت کا نتیجہ ہے۔ اس نے لوہے کی وزنی پٹیاں کندھے سے اتار کر دہکتی ہوئی بھٹی کے قریب پھینکتے ہوئے سوچا اور غصے سے شوکت کی طرف دیکھا جو لوہا اٹھوا اٹھوا کر پگھلانے کے لیے بھٹی میں ڈلوا رہا تھا۔

اس زمانے میں ابھی جدید برقی مشینوں کی سہولت حاصل نہیں تھی اور لوہے کی صنعت اسی قسم کی بھٹیوں پر منحصر تھی...... بھٹی میں لوہا پگھلایا جا رہا تھا کہ جب وہ پگھل کر مائع شکل اختیار کر لے تو اسے گھنٹے کی شکل کے سانچے میں ڈالا جائے۔

شام ہونے کو تھی۔ کافی مزدور چھٹی کر کے جا چکے تھے۔ جو اوور ٹائم کے لیے روکے گئے تھے وہ بھٹی کی نگرانی کر رہے تھے۔ انھی میں ندیم اور شوکت بھی تھے۔ شوکت ایک بلند مچان پر کھڑا اوپر سے بھٹی میں جھانک رہا تھا۔ ندیم نے دیکھا تو اس کے دل میں ایک نہایت خوف ناک خیال پیدا ہوا۔

''کاش شوکت اس طرح جھانکتے ہوئے بھٹی کے اندر گر جائے!''

پھر یہ شیطانی خیال رہ رہ کر اس کے ذہن میں گونجنے لگا۔

''اگر ایسا ہو جائے تو اس سارے سونے کا میں اکیلا مالک بن سکتا ہوں!''

اس نے سوچا اور حرص نے اس کے دل اور دماغ میں اپنے زہریلے پنجے گاڑ دیئے۔

رفتہ رفتہ یہ سوچ اس کا ارادہ بن گئی اور وہ اپنے اس مکروہ ارادے کو عملی صورت دینے پر آمادہ ہو گیا...... وہ اب اس مچان کے آس پاس منڈلانے لگا کہ اب جس وقت شوکت مچان پر جائے گا وہ اپنا یہ ظالمانہ کام کر گزرے گا۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ مزدوروں نے باری باری رات بھر بھٹی میں لکڑیاں جھونکتے رہنا تھا۔ شوکت ان کو کچھ ہدایات دے کر مچان کی طرف بڑھا۔ ندیم قریب ہی بیزار سا کھڑا تھا۔ شوکت نے اس کی طرف دیکھا اور اسے تسلی دینے کے لیے بولا۔

''تھک گئے ہو کیا؟ بس میں ذرا بھٹی کو دیکھ آؤں تو چلتے ہیں۔ اب یہاں ہمارا کام ختم ہو چکا ہے''۔

اتفاق سے اس وقت اس جگہ کوئی نہیں تھا۔ ایندھن جھونکنے والے مزدور کافی دور تھے۔ ندیم بھی دبے پاؤں شوکت کے پیچھے مچان پر چڑھ آیا۔ جیسے ہی شوکت منہ پر کپڑا لپیٹ کر اور آنکھوں پر شیشہ چڑھا کر بھٹی میں جھانکنے لگا' ندیم نے لپک کر اسے آگے دھکیل دیا۔ شوکت نے تو پہلے ہی منہ پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ اگر اس نے کوئی آواز نکالی بھی تو وہ کسی کو سنائی نہ دی اور ندیم چپکے سے نیچے اتر کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ جب تک وہ گھر پہنچا بے چارے شوکت کا گوشت پوست بھی لوہے کے ساتھ پگھل کر پانی ہو گیا۔

شوکت کے متعلق ندیم نے سب کو یہی بتایا کہ وہ ''اوور ٹائم'' پر تھا تو میں چھٹی کر کے گھر چلا آیا۔ فیکٹری کے ٹائم کیپر کو بھی رات وہ یہی رپورٹ دے کر آیا تھا کہ شوکت ابھی تک ڈیوٹی پر ہے اور وہ چھٹی کر کے جا رہا ہے۔

شوکت کی اچانک گم شدگی پر سب حیران تھے۔ مگر کوئی بھی اس مسئلے کو حل نہ کر سکا تھا۔

ندیم نے سونے سے بھرا اٹیچی کیس اپنے قبضے میں لے کر گھر میں چھپا دیا مگر پھر بھی اس کے دل کو ایک عجیب قسم کی بے چینی لاحق تھی۔ اس نے اب ایک دم ملازمت چھوڑنی بھی مناسب نہ سمجھی اور بدستور فیکٹری جاتا رہا۔

گھنٹا بن کر گرجا گھر میں نصب کر دیا گیا۔ جس دن اس کا افتتاح ہونا تھا شہر کے سب لوگ نہ صرف مسیحی بلکہ ہر طبقہ کے شہری گرجا گھر کی طرف جا رہے تھے۔ مسیحی تو اس نئے گرجے میں پہلی عبادت میں شریک ہونے آئے تھے۔ کچھ لوگ شغل کے طور پر چلے آئے تھے۔ ان میں ندیم بھی تھا۔

گھنٹا بجنا شروع ہو گیا تھا جو عبادت شروع ہونے کا اعلان

تھا۔ جیسے ہی گھنٹے کی پہلی آواز بلند ہوئی ندیم کی عجیب کیفیت ہو گئی......وہ بوکھلا کر چاروں طرف دیکھتا......

"یہ گھنٹے کی گونج میں ایک اور عجیب سی کیا آواز ہے؟"

جیسے کوئی کانپتی ہوئی آواز کہ رہی ہو "مجھے ندیم نے مارا.....مارا.....را....." ندیم نے.....مارا.....مارا.....را"

ندیم کان بند کر کے وہاں سے بھاگا۔ لیکن گھنٹے کی آواز تو سارے شہر میں سنائی دے رہی تھی اور گھنٹے کی گونج کے اندر وہ پراسرار آواز بھی خصوصاً ندیم کو مسلسل سنائی دے رہی تھی

"ندیم نے مارا.....مارا.....مارا....." کی لرزتی ہوئی آواز گونجتی رہتی۔

ندیم غور سے لوگوں کے چہرے دیکھتا کہ دوسرے اس آواز کا کیا اثر لیتے ہیں مگر وہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہے تھے۔ پھر جب بھی عبادت کے لیے گرجے کا گھنٹا بجتا' ندیم کی یہی کیفیت ہوتی۔ وہ جہاں بھی جاتا آواز اس کا تعاقب کرتی۔ "ندیم نے مارا" وہ گرد و پیش موجود لوگوں کو گھورتا' یوں لوگ اسے پاگل سمجھنے لگے۔ پھر ایک مرحلہ آیا کہ ندیم واقعی ہوش و حواس



کھو بیٹھا۔ جب بھی گھنٹا بجتا اور وہ خاص آواز اس کی سماعت میں گونجتی' وہ برملا کہنے لگتا۔

"میں نے شوکت کو نہیں مارا' میں نے تو شوکت کو نہیں مارا۔ یہ جھوٹ کہ رہا ہے؟"

لوگ پوچھتے "کس کی بات کرتے ہو؟ کون کہ رہا ہے؟"

وہ جواب دیتا "یہ......یہی گھنٹا......گھنٹے کے اندر شوکت ہے نا' اس کے اندر شوکت کہ رہا ہے...... مجھے ندیم نے مارا! نہیں نہیں' میں نے نہیں مارا۔ میں نے نہیں مارا"۔ وہ سر پر دونوں بازو رکھ کر جیسے چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا چلا جاتا۔

بعض لوگ ترس کھا کر کہتے۔ "دوست کے صدمہ میں پاگل ہو گیا ہے" مگر کئی لوگ کہتے "اسی نے شوکت کو مارا ہے۔ اب پاگل بن کر قانون سے بچنا چاہتا ہے"۔

جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہونے لگیں۔

ایک دن ندیم کے سر پر قیامت اعمال ہوا تو وہ سونے والا اٹیچی کیس لے کر کہیں چل پڑا۔ شوکت کے قتل کے شبہ میں پولیس خفیہ طور پر اس کی نگرانی تو کر ہی رہی تھی۔ اٹیچی کیس لے کر مشتبہ حالت میں جاتے دیکھ کر اسے گرفتار کر لیا۔ سونے کے مالک نے پولیس میں رپورٹ درج کرا رکھی تھی۔ شناخت کے بعد اٹیچی کیس اس کے حوالے کر دیا گیا۔ اب ندیم پر دو کیس بن گئے۔ قتل کے علاوہ وہ اب چوری کا بھی مجرم تھا جو چوری کے مال کے ساتھ رنگے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا مگر ذہنی مریض ہونے کے باعث ابھی اس پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ اس لیے فی الحال اسے ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔

گھنٹے کی آواز یہاں بھی سنائی دیتی تو وہ چھپنے کے لیے کونے کھدروں میں سر دیتا پھرتا اور یہی کہتا "میں نے نہیں مارا' شوکت جھوٹ کہتا ہے۔ اسے میں نے نہیں مارا"۔

وہ گھنٹے کی آواز نہیں بلکہ خود اس کے ضمیر کی آواز تھی جو اسے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ پہلے وہ حرص کا اسیر ہو کر قاتل بنا اب ضمیر کا قیدی تھا اور اس کی حالت پر موت کو ترجیح دی جا سکتی تھی۔



آپ بھی لکھیے

بہترین دوست

محمد عثمان نظر ،فیصل آباد

وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ مشکل وقت میں کام آنے والا' دکھ درد میں حوصلہ افزائی کرنے والا۔ ایسا دوست جو قسمت ہی سے کسی کو ملتا ہے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک مخلص دوست میں ہونی چاہئیں۔ اس نے بہت سے موقعوں پر میری بروقت اور صحیح سمت میں رہ نمائی کی تھی۔ بہت دفعہ مجھے دل برداشتہ ہونے سے بچایا اور مایوسیوں کے تاریک اندھیروں میں بھٹکنے سے محفوظ رکھا تھا۔ مگر میں نے اس کی قدر نہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں اپنے اسکول کے سالانہ ٹورنامنٹ کے فائنل میں اپنے روایتی حریف امجد سے ہار گیا تھا تو کتنا دل برداشتہ تھا۔ ٹورنامنٹ کے آغاز پر ہی امجد نے مجھے چیلنج دیتے ہوئے کہا تھا۔ "تم چاہے کچھ بھی کرلو میرا چار سالہ اعزاز نہیں چھین سکتے"۔

"قسمت ہر مرتبہ ساتھ نہیں دیتی' امجد! اس مرتبہ میں ضرور جیتوں گا"۔

میں نے اس کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔ سخت حریفوں کو شکست دے کر میں فائنل میں پہنچا تھا۔ فائنل میں زوردار مقابلے کے باوجود میرا پلڑا بھاری تھا۔ لیکن میچ کے آخری مرحلے پر میں ایک معمولی سی غلطی کے باعث ہار گیا۔ اس کے بعد میں اس قدر دل برداشتہ تھا کہ اسکول ہی چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس نازک موقع پر بھی اس نے مجھے سہارا دیا۔ "دیکھو دوست' کسی چیز کی خواہش کرنے سے وہ مل نہیں جاتی۔ اس کے لیے مسلسل محنت اور جدوجہد درکار ہوتی ہے۔ تمہیں شاید مزید محنت کی ضرورت تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگلے سال تم ضرور کام یاب ہو گے"۔

اس کی انہی باتوں نے میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی اور اگلے سال میں نے واقعی فائنل میں امجد کو شکست سے دوچار کر دیا۔ میری اس عظیم کام یابی کا کریڈٹ بھی اسی کو جاتا تھا۔

اب کچھ دنوں سے وہ مجھ سے سخت ناراض تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ مجھ سے اس قدر خفا ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ میٹرک کا امتحان قریب آرہا تھا اور میں نے اپنے کزن کی مدد سے میٹرک کے تمام پیپر قبل از وقت حاصل کر لیے تھے۔ اس نے مجھے بہت سمجھایا تھا کہ یہ بے ایمانی کا کام نہ کرو لیکن میں اس کی بات کیسے مان سکتا تھا۔ میں تو زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر جب رزلٹ آیا تو میں نے بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ سبھی بہت خوش تھے سوائے اس کے۔ میں نے اسے منانا چاہا لیکن وہ مسلسل روٹھا رہا۔

"تم نے ظلم کیا ہے' اپنے ساتھ اور ان تمام طالب علموں کے ساتھ جنہوں نے محنت اور دیانت داری سے امتحان دیا تھا"۔

"لیکن اچھے نمبر حاصل کرنے کے لیے تو......" میں نے کہنا چاہا مگر وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"دیکھو دوست! یہ دنیاوی امتحان عارضی ہیں۔ کیا تمہیں آخرت کے امتحان کی کوئی فکر نہیں؟ کیا وہاں بھی تم اس طرح کام یاب ہو سکتے ہو؟"

اس کی باتوں سے میں لرز اٹھا۔ مجھے غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔

"مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

"اگر انسان واپسی کا ارادہ کرلے تو وہ لوٹ ہی آتا ہے۔ اب بھی وقت ہے 'لوٹ آو'" اس نے کہا۔

اور پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ ایک ناقابل یقین فیصلہ' اب میں بالکل مطمئن تھا۔

پھر جب رزلٹ کارڈ میرے ہاتھوں میں آیا تو میں نے اس کے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دیئے اور اگلے سال دوبارہ امتحان دینے کے لیے پر تولنے لگا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اب میری اور اس کی ناراضگی ختم ہو چکی تھی اور میں اسے کبھی ناراض نہ کرنے کا عہد کر چکا تھا۔

ساتھیو! کیا آپ میرے اس دوست کا نام جاننا چاہیں گے؟...... تو سنئے 'اس کا نام ہے ضمیر...... جی ہاں' میرا اپنا ضمیر' وہی میرا بہترین دوست ہے۔ جس پر میں بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

پہلی سیڑھی

چودھری آصف حمید' لاہور

سر ہدایت کے آخری پریڈ میں سارے بچے اپنے اپنے خیالوں میں گم ہوتے ہیں کیوں کہ وہ معاشرتی علوم کو حساب کے سوالوں کی طرح حل کر رہے ہوتے ہیں اور ہمارے ذہنوں میں ہل چل مچی ہوتی ہے۔

"فراز' اوئے فراز" میں نے ساتھ بیٹھے فراز کو ہولے سے پکارا۔

"اوں' ہاں کیا ہوا؟" فراز نے چونکتے ہوئے کہا (وہ غالباً خیالوں میں اپنے آسٹریلین طوطوں کو باجرہ ڈال رہا تھا)۔

"یار! ٹائم کیا ہوا ہے؟"

"5 منٹ پہلے جو ٹائم بتایا تھا اس میں 5 منٹ کا اضافہ کر لو" فراز نے گھورتے ہوئے کہا۔

مجھے اصل میں چھٹی کی صرف اس لیے جلدی تھی کہ میں گھر پہنچ کر کانوں کو سرسوں کے تیل سے اچھی طرح تر کر لوں۔ یہ مت سمجھئے گا کہ میں پہلوانوں کی طرح مونچھوں کے بجائے کانوں سے اینٹیں اٹھانے کے کسی مظاہرے میں شرکت کا خواہش مند ہوں بلکہ قصہ صرف اتنا ہے کہ صرف تین ماہ پہلے بھائی جان نے ایم کام کا امتحان پاس کیا تھا اور تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے کسی بڑی ملازمت کے حصول میں ناکام رہے تھے۔ وہ کبھی سفارشی امیدواروں کو کوستے تو کبھی ملک کے ناہموار معاشی حالات کا رونا رونے لگتے۔ ایک دن میں نے موڈ ٹھیک دیکھ کر کہا" بھائی جان' کان کی امان پاؤں" تو کچھ عرض کروں"

"ہاں بول بول آج مابدولت بہت خوش ہیں"

میں نے دل ہی دل میں یا اللہ خیر کا ورد شروع کر دیا کیوں کہ جس دن بھائی جان خوش ہوں اس دن اپنے کسی دوست سے ملنے جاتے ہیں اور اس سے ٹھیک دو گھنٹے پہلے مجھے حکم ہوتا ہے کہ چل چھوٹے ذرا میری موٹر بائیک چمکا دے یا پھر فلاں جوتا پالش کر دے۔ لیکن اس دن خیر ہی رہی اور میں نے عرض کی" بھائی جان' اگر کوئی بڑی ملازمت نہیں ملتی تو کوئی چھوٹی ملازمت ہی کر لیں"

بھائی جان نے فوراً لال سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔ میں نے فوراً ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے "امی' امی" بھائی جان نے زور سے امی کو آواز دی۔

"کیا ہو گیا؟ کیا ہوا؟" امی کے ساتھ ابو بھی گھبرائے ہوئے آ گئے۔

"ابو' امی' ذرا یہ بتائیں کہ یہ چھوٹا عمر میں مجھ سے کتنا چھوٹا ہے؟" بھائی جان نے بدستور مجھے غصے سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

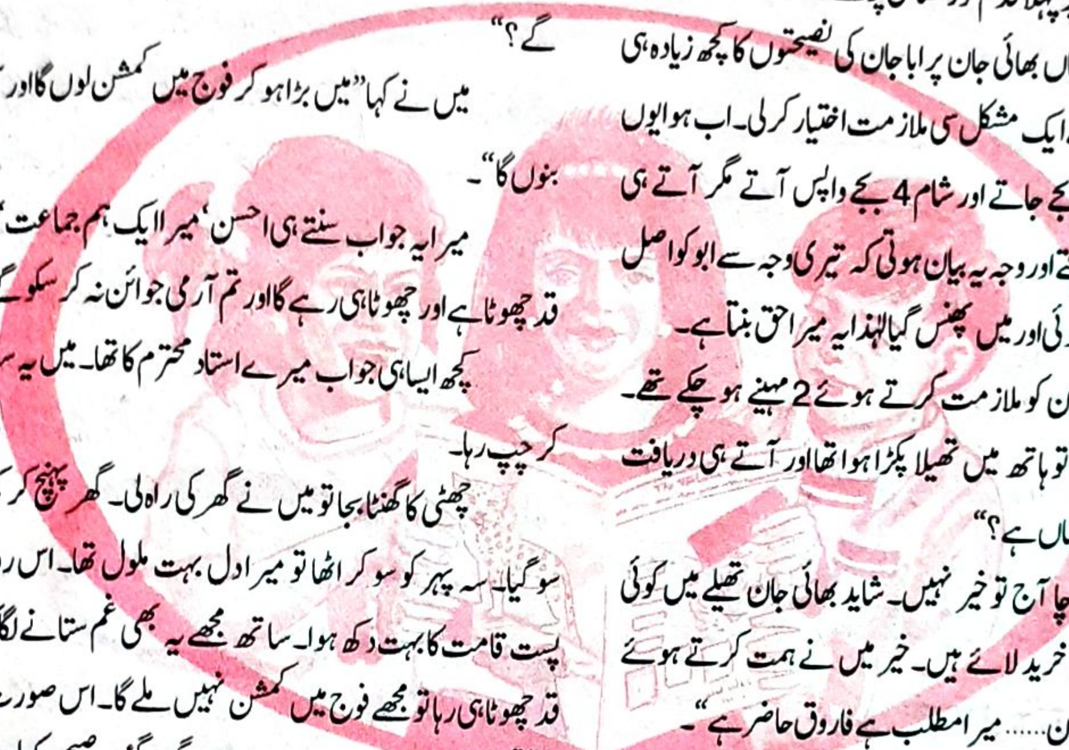
"اتنی سی بات کے لیے بلایا تھا۔ یہ تو تم فاروق ہی سے پوچھ لیتے" (گھر میں چھوٹا مجھے صرف بھائی جان ہی کہتے ہیں)۔ امی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اوہو' یہ تو خیر مجھے بھی معلوم ہے کہ یہ موصوف پورے آٹھ برس چھوٹے ہیں مگر میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جناب عالی مجھے یعنی اپنے برادر بزرگ وار کو مشورے عنایت کر رہے ہیں اور وہ بھی بلاقیمت"۔

"ہائیں کیسے مشورے؟" مشورے کا سنتے ہی ابو بولے۔

"دیکھیں نا ابو' یہ چھوٹا کہتا ہے کہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کر لوں۔ اب آپ خود سوچیں میرے جیسا لائق فائق شخص جو ہر جماعت میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا' تقریری مقابلوں میں اول آتا رہا' اب محض اسی قابل رہ گیا ہے کہ کوئی چھوٹی موٹی گھٹیا ملازمت کرتا پھرے"

"دیکھو آصف" ابو جان نے بھائی جان کو سمجھاتے ہوئے کہا "ہم لوگوں کو تمہاری نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں مہارت اور قابلیت پر ہرگز کوئی شک نہیں مگر بیٹا یہ یاد رکھو کہ ملازمت کوئی بھی گھٹیا نہیں ہوتی۔ کیا تمہیں وہ حدیث یاد نہیں کہ ہاتھ سے کمانے والا اللہ کا



دوست ہے۔ ٹھیک ہے تم اونچا مقام چاہتے ہو مگر بیٹا' اونچائی پر پہنچنے کے لیے بھی سیڑھی پر پہلا قدم تو رکھنا ہی پڑے گا"۔

نصیب دشمناں بھائی جان پر ابا جان کی نصیحتوں کا کچھ زیادہ ہی اثر ہو گیا اور انہوں نے ایک مشکل سی ملازمت اختیار کر لی۔ اب ہوا یوں کہ بھائی جان صبح 8 بجے جاتے اور شام 4 بجے واپس آتے مگر آتے ہی میرے کان ضرور کھینچتے اور وجہ یہ بیان ہوتی کہ تیری وجہ سے ابو کو اصل صورت حال معلوم ہوئی اور میں پھنس گیا لہٰذا یہ میرا حق بنتا ہے۔

اب بھائی جان کو ملازمت کرتے ہوئے 2 مہینے ہو چکے تھے۔

ایک دن واپس آئے تو ہاتھ میں تھیلا پکڑا ہوا تھا اور آتے ہی دریافت کرنے لگے "فاروق کہاں ہے؟"

میں نے سوچا آج تو خیر نہیں۔ شاید بھائی جان تھیلے میں کوئی کان کھینچنے والی مشین خرید لائے ہیں۔ خیر میں نے ہمت کرتے ہوئے کہا "لیجئے بھائی جان کان...... میرا مطلب ہے فاروق حاضر ہے"۔

مگر وہ سنجیدگی سے بولے "جاؤ امی اور ابو کو بھی بلاؤ"۔

میری رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ میں نے سوچا کہ یا تو ملازمت سے نکالے گئے ہیں یا خود ہی چھوڑ کر آ گئے ہیں۔ خیر جونہی امی اور ابو آئے تو بھائی جان نے تھیلے میں سے مٹھائی کا ڈبہ نکالتے ہوئے کہا "ابو جان' آج تو کمال ہی ہو گیا۔ آج ہمارے ڈائریکٹر صاحب تشریف لائے تھے۔ انہوں نے میری اسناد دیکھیں تو بولے' میاں تم یہاں کہاں جھک مار رہے ہو۔ تمہیں تو اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ میں ہونا چاہیے۔ لہٰذا آج سے عابدولت اے سی والے کمرے میں کام کریں گے اور تنخواہ بھی دگنی ہو گی۔ اور آج اس مٹھائی پر پہلا حق چھوٹے کا ہے" بھائی جان نے میرے منہ میں لڈو ٹھونستے ہوئے کہا اور سب ہنسنے لگے مگر میں سوچنے لگا "ابو جان نے سچ ہی کہا تھا کہ اونچے مقام پر پہنچنے کے لیے سفر ہمیشہ پہلی سیڑھی سے شروع کرنا پڑتا ہے" (دوسرا انعام: 90روپے کی کتابیں)

پست قامت

ناہید انجم' لاہور

یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ جماعت کے سارے لڑکے مجھے "چھوٹو" کہ کر پکارتے تھے۔ سوائے میرے جماعت کے سارے لڑکے قد و قامت کے لحاظ سے ٹھیک ٹھاک تھے۔ ایک دن استاد نے پوچھا "آپ بڑے ہو کر کیا بنیں گے؟"

میں نے کہا "میں بڑا ہو کر فوج میں کمشن لوں گا اور آرمی آفیسر بنوں گا"۔

میرا یہ جواب سنتے ہی احسن' میرا ایک ہم جماعت' بولا "تمہارا قد چھوٹا ہے اور چھوٹا ہی رہے گا اور تم آرمی جوائن نہ کر سکو گے"۔

کچھ ایسا ہی جواب میرے استاد محترم کا تھا۔ میں یہ سب کچھ سن کر چپ رہا۔

چھٹی کا گھنٹا بجا تو میں نے گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر کھانا کھایا اور سو گیا۔ سہ پہر کو سو کر اٹھا تو میرا دل بہت ملول تھا۔ اس روز مجھے اپنی پست قامت کا بہت دکھ ہوا۔ ساتھ مجھے یہ بھی غم ستانے لگا کہ اگر میرا قد چھوٹا ہی رہا تو مجھے فوج میں کمشن نہیں ملے گا۔ اس صورت میں میرا مستقبل کیا ہو گا؟ رات اسی ادھیڑ بن میں گزر گئی۔ صبح اسکول جانے کے لیے اٹھا تو میرا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ ماما نے مجھے ناشتے کے لیے کہا تو میں نے انہیں بتایا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ یہ سن کر وہ بولیں۔

"آج آپ اسکول نہیں جاؤ گے" اتنا کہ کر انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا۔ مجھے واقعی بخار تھا۔ میں نے صرف دودھ کا ایک گلاس پیا اور ماما سے بغیر کچھ کہے سنے دوبارہ بستر میں لیٹ گیا۔

جونہی ماما ناشتے سے فارغ ہوئیں وہ مجھے قریبی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ ڈاکٹر نے میرا چیک اپ کیا۔ اس وقت میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ بظاہر تو مجھے بخار تھا لیکن دل میں غم اپنے چھوٹے قد کا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کا اظہار ڈاکٹر صاحب سے کیا تو وہ میری بات سن کر مسکرا دیئے اور پھر کہنے لگے "تمہارا قد بڑھ سکتا ہے"۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا تو وہ کہنے لگے "اس کے لیے ضروری ہے کہ تم دودھ پیا کرو۔ صبح کی سیر تمہارے لیے لازمی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ پابندی سے نماز پڑھا کرو۔ صبح جب باغ میں سیر کے لیے نکلو تو درختوں کی شاخوں کو اچھل اچھل کر ضرور پکڑا کرو"۔

اتنا کہ کر ڈاکٹر صاحب خاموش ہو گئے۔ تب میں نے ان سے پوچھا "کیا آپ مجھے کوئی دوا نہیں دیں گے جس سے میرا قد جلد از جلد بڑھ جائے؟"

اس پر وہ کہنے لگے۔ "فی الحال تم بخار کی دوا لو۔ اس کے بعد آنا پھر تمہارے مسئلے کا حل سوچیں گے"۔

میں دوا لے کر ماما کے ہم راہ گھر آ گیا۔ پھر چند روز بعد حسب وعدہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے مجھے پیار سے پوچھا "تم "چھوٹو" لفظ سے کیوں چڑتے ہو؟"

میں چپ رہا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا 'چھوٹا قد کوئی عیب نہیں۔ بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جس کے ارادے اور خیالات بلند ہوں۔

خدا کرے تمہارا قد بڑھ جائے اور تمہاری آرزو بھی پوری ہو جائے۔ ہاں اگر ایسا نہ ہوا تو گھبرانا نہیں' ہمت سے کام لینا۔ زندگی کا جو بھی نصب العین ہمارے سامنے ہے اس کے لیے ہمت و حوصلے کے ساتھ ساتھ محنت اور لگن لازمی ہے۔ یوں تمہیں ضرور کامیابی ملے گی۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟" ڈاکٹر صاحب مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

ان کا کہنا واقعی سچ تھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ آئندہ اپنی پست قامت کا خیال دل میں نہیں لاؤں گا۔

آج میں دسویں جماعت کا طالب علم ہوں۔ لوگ مجھے چھوٹو ہی کہہ کر پکارتے ہیں مگر میں برا نہیں مناتا (تیسرا انعام: 80روپے کی کتابیں)

دل چسپ واقعہ

عائشہ احسان ملک 'لاہور

زیادہ پرانی نہیں...... یہی کوئی دس بارہ ماہ پہلے کی بات ہے۔ فروری کا سرد مہینا' شادی کے باعث گھر میں مہمانوں کی آمد اور ہم' یہ میری سب سے بڑی بہن عندلیب کی شادی تھی۔ مہندی اور بارات کے مواقع گزر چکے تھے۔ اس دن ولیمے کی تقریب تھی۔ ہم سب بہت خوش تھے۔ رات کو جب تقریب کے لیے نکلنے کا وقت آیا تو اتفاق سے ایسا ہوا کہ تمام بزرگان خاندان گاڑیوں میں بیٹھ گئے اور بچے کھچے لوگوں میں صرف بچے ہی باقی رہ گئے اور ایک ویگن' وہ بھی ایسے ڈرائیور کے ساتھ جو بے چارا دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ اور تو اور وہ لاہور میں نیا نیا تعینات ہوا تھا جس وجہ سے وہ راستوں سے بھی ناواقف تھا۔

سب چار و ناچار ویگن میں ٹھنس گئے تو ویگن چلنے کو تیار ہوئی۔ مگر پھر دور سے ہمارے دو انکل بھاگ کر آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ غالباً جگہ کی کمی کے باعث ان کو بھی اسی ویگن میں بیٹھنا تھا۔ وہ ہمارے دونوں انکل بھی لاہور سے کافی حد تک ناآشنا تھے۔ وہ راستہ جس تک ہمیں پہنچنا تھا اس کا اگر کسی کو تھوڑا بہت پتا تھا تو وہ میں ہی تھی۔ آخر گاڑی روانہ ہوئی۔ بچے خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ ڈرائیور اندھا دھند گاڑی دوڑا رہا تھا اور جہاں تک جا سکتا تھا وہ گیا۔ آخر کار اس نے گاڑی روک دی۔ عین سڑک کے درمیان میں...... ڈرائیور نے صاف کہہ دیا کہ اس سے آگے جانا اس کے بس کی بات نہیں۔ کیوں کہ وہ راستے سے بالکل بے خبر ہے۔

ایک تو رات کا وقت اور وہ راستے جن پر ہم زیادہ تر دن ہی کو سفر کرتے تھے اب تو بالکل انجان لگ رہے تھے۔ میں نے اپنی عقل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تین چار بار ڈرائیور کو راستہ بتایا لیکن یہ کیا...... بھول بھلیوں کی طرح ہم تو پھر اسی روڈ پر آ کھڑے ہوئے تھے...... اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی پٹرول پمپ کی طرف لے جانے کے لیے کہا۔ اتفاق سے اس پٹرول پمپ کو ہم جانتے تھے۔ وہاں پہنچ کر میں اتر کر اندر آفس میں گئی اور فون کرنے کی اجازت مانگی۔ مگر شومئی قسمت فون خراب نکلا۔ پھر میں نے وہاں کھڑے ایک آدمی سے کہا۔ "جناب براہ مہربانی ہمارے ڈرائیور کو پی اے ایف بیس کا راستہ سمجھا دیجیے"

وہ شخص بت بنا مجھے کو دیکھتا رہا۔ میں اسے گونگا سمجھ کر گاڑی میں واپس گئی۔ جب دروازے پر پہنچی تو وہی شخص ہماری گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی چلانے لگا اور بڑبڑاتے ہوئے بولا "کہاں پمپ پر لے آئے مجھے...... یہاں تو کوئی بھی نہیں"

تب ساری بات سمجھ میں آئی۔ دراصل وہ ہمارا ڈرائیور ہی تھا جسے ہم پٹرول پمپ کا ملازم سمجھ کر راستہ پوچھ رہے تھے۔ پھر ہم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ آخر کار اللہ کی مہربانی سے

ہمارے بزرگ گاڑی لے کر ہمیں تلاش کرتے ہوئے آ گئے اور ہم خیریت سے تقریب میں شامل ہو گئے (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

......اور شیشے بچ گئے

نوید الٰہی، ڈیرہ اسماعیل خان

"ٹھاہ" ایک زوردار چھناکے کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز سن کر طاہر کی امی لان میں آئیں اور ٹوٹے ہوئے شیشے کو دیکھتے ہی سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ یہ چوتھا شیشہ تھا جو طاہر کی ماہرانہ بیٹنگ کے نتیجے میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔

"طاہر! تم کوئی اور گیم نہیں کھیل سکتے؟" اس کی امی غصے سے بولیں۔

"امی، آپ باہر روڈ پر بھی نہیں کھیلنے دیتیں تو ہم لان میں بھی نہ کھیلیں"۔

"اور کرکٹ کھیلنے سے ورزش بھی تو ہوتی ہے"۔ ثاقب نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

اسی وقت باہر گاڑی کے ہارن کی آواز آئی اور طاہر بھاگتا ہوا گیٹ کھولنے چلا گیا۔ طاہر کے ابو جیسے ہی گاڑی سے نکلے تو طاہر کا شاندار کارنامہ دیکھ کر کھڑے کے کھڑے رہ گئے کیوں کہ نیا شیشہ بہرحال انہی نے لگوانا تھا۔ خیر وہ سب بچوں کو لے کر اندر لاؤنج میں آئے اور جب سب بیٹھ گئے تو وہ بولے "کیوں بھئی آپ لوگ باہر گراؤنڈ میں کیوں نہیں کھیلتے"۔

"کون سے گراؤنڈ میں انکل؟" ثاقب بول پڑا۔

"ارے بھئی وہی جو چودھری صاحب کے گھر کے سامنے ہے"۔

"اس گندے گراؤنڈ میں" تقریباً سب چلا اٹھے۔

ثاقب نے کہا "انکل، وہاں تو سب گندگی پھینکتے ہیں"

"آپ لوگ اس گراؤنڈ کو صاف بھی تو کر سکتے ہیں"

طاہر کے ابو بولے "میں آج ہی کارپوریشن والوں کو فون کرتا ہوں۔ وہ ٹرالی بھیج کر ساری گندگی اٹھا لیں گے"۔ سب بچے خوش ہو گئے۔

اگلے دن کارپوریشن والوں نے کوڑا کرکٹ اکٹھا کیا اور لے گئے۔ یوں کوڑے سے بھرا گراؤنڈ ایک خوب صورت کرکٹ گراؤنڈ بن گیا۔ اس طرح تمام کالونی کے والدین نے سکھ کا سانس لیا۔ کیوں کہ اب ہر گھر کی کھڑکیوں کے شیشے محفوظ ہو چکے تھے

(پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

دوسروں کا خیال

محمد اسلم خان، غوری والا

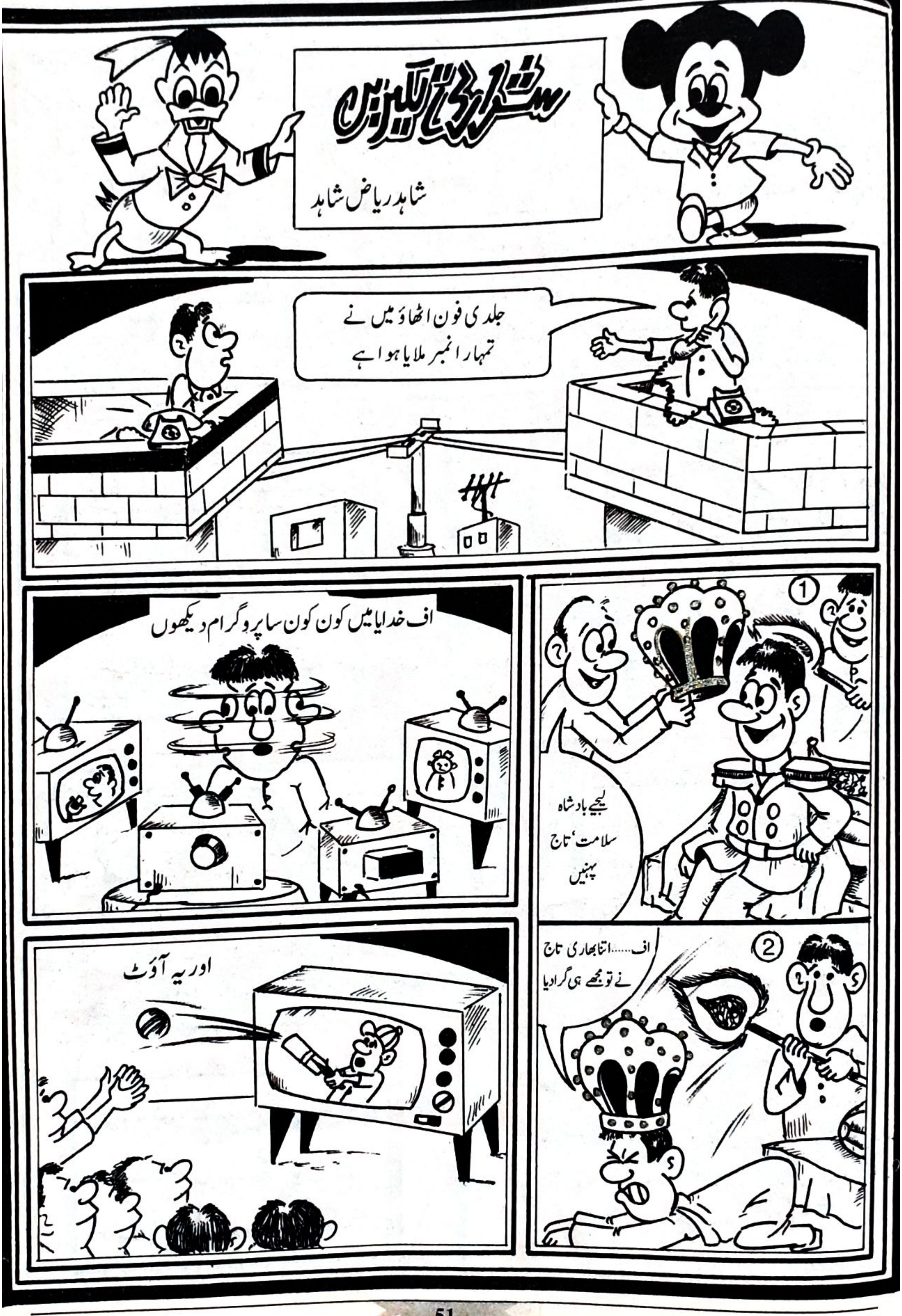
کالج سے تین دن کی چھٹی ملی تو میں خراماں خراماں بس اسٹاپ پر پہنچا اور گجرات جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔

یوں تو میں اس دن خوش تھا مگر طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ بس میں کچھ دیر تو آرام سے گزری لیکن تھوڑی دیر بعد ڈرائیور صاحب نے فل آواز سے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ گویا سبھی بہرے بیٹھے ہوں۔ میں نے سیٹ سے اٹھ کر ڈرائیور سے التماس کی کہ وہ ٹیپ بند کر دیں لیکن انہوں نے ٹیپ بند نہ کرنا تھی نہ کی۔ چار و ناچار میں واپس سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میرے ساتھ چالیس پینتالیس سال کا آدمی بیٹھا تھا۔ مجھے دھوئیں سے الرجی ہے۔ دھوئیں کی وجہ سے فوراً زکام ہو جاتا ہے اور چھینکیں آنے لگتی ہیں۔ مگر میرے ساتھ بیٹھے اس آدمی نے تھوڑی دیر بعد سگرٹ سلگا لیا اور اب جب کش لینے کے بعد دھواں منہ سے نکالتا تو اپنا منہ میری جانب کر لیتا۔

میں سارے راستے یہی سوچتا آیا کہ کیا ٹیپ ریکارڈ چلائے بغیر بس نہیں چلائی جا سکتی یا سگرٹ کا دھواں دوسروں پر پھینکے بغیر سگرٹ پینے جیسی بری عادت پوری نہیں ہوتی۔ یہ عادتیں ہم نے پوری کرنا ہی ہیں تو کرتے رہیں مگر ہمیں کم از کم دوسروں کا تو خیال رکھنا چاہیے (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

* * *


شاہد ریاض شاہد
جلدی فون اٹھاؤ میں نے تمہارا نمبر ملایا ہوا ہے
لیجیے بادشاہ سلامت، تاج پہنیں
اف......اتنا بھاری تاج نے تو مجھے ہی گرا دیا
اف خدایا میں کون کون سا پروگرام دیکھوں
اور یہ آؤٹ

گنجو میاں نے کی تیراکی





ابھی ان کو
چھلانگ لگا کر
دکھاتا ہوں
اس کے بعد گنجو میاں نے کپڑے اتارے
اور تالاب کے اوپر والے حصے پر چھلانگ
لگانے کے لیے کھڑے ہو گئے
اور پھر آؤ دیکھا نہ
تاؤ جھٹ چھلانگ لگا
دی۔
لو جی میں آرہا
ہوں نیچے پانی
میں
آئی
اوئی
اوئے
اور گنجو میاں جب نیچے گئے تو بس پھر کیا
بتائیں، صرف 3 فٹ گہرے پانی میں ان کا
کیا حشر ہونا تھا آپ خود ہی سوچیں۔
اور جب گنجو میاں نے لمبو میاں
اور ملک صاحب کو تالاب کے
کنارے ہنستے دیکھا تو سب کچھ
سمجھ گئے اور غصے سے بولے
یاد رکھنا میں بھی
چھوڑوں گا نہیں تمہیں



ریچھ کا شکار

سلیم خان گمی

اشرف خاں تڑکے گاؤں کی مسجد سے نماز پڑھ کر حویلی کی طرف جا رہا تھا کہ اسے مولو نے بتایا کہ حیاتے کو رات دریا پار جنگلی ریچھ نے چیر پھاڑ ڈالا ہے۔ وہ خود کھیت میں موجود تھا لیکن جنگلی ریچھ کا مقابلہ نہ کر سکا اور دریا پار کر کے اسے بتانے آیا کہ اس کے چنگڑ حیاتے کو جنگلی ریچھ نے ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔

"جنگلی ریچھ کتنے بجے کھیت میں آیا؟" اشرف خاں نے مولو سے پوچھا۔

"یہی کوئی رات کے آٹھ نو بجے"۔

"حیاتا کہاں تھا اس وقت؟"

"حیاتا اس وقت روٹی کھا رہا تھا"۔

"تو اس وقت کہاں تھا؟"

"میں تو اس وقت انڈین بارڈر کے ساتھ ساتھ پہرہ دے رہا تھا"۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تو حیاتے چنگڑ سے کافی دور تھا"۔

"ہاں، میں اس سے کافی دور تھا۔ ایک فرلانگ کا فاصلہ ہوگا میرے اور حیاتے چنگڑ کے درمیان"

"کیسے پتا چلا تجھے کہ جنگلی ریچھ نے حیاتے چنگڑ کو چیر پھاڑ ڈالا ہے؟"

"اس کی چیخیں سن کر، رات کو چیخ دور تک سنی جاتی ہے۔ جنگلی ریچھ حیاتے چنگڑ کی شہ رگ اپنے تیز نوکیلے لمبے لمبے دانتوں سے کاٹ کر اس کا لہو پی رہا تھا...... میرے شور مچانے اور برچھی سے حملہ کرنے پر تلوں کے کھیت میں سے انڈین بارڈر کی طرف بھاگ نکلا"۔

"تو نے اس کا پیچھا نہ کیا؟"

"جی نہیں، دراصل میں حیاتے کی لاش، جو خون میں لت پت تھی، دیکھ کر ڈر گیا تھا"۔

"وہ علاقہ ریچھوں کا تو نہیں لیکن گورداس پور، پٹھان کوٹ اور جموں کی طرف سے بعض اوقات جنگلی اور پہاڑی ریچھ نارووال اور شکر گڑھ کے کھیتوں کی طرف آنکلتے ہیں۔ خاص طور پر دریائے راوی کے ساتھ بیلے اور جنگل میں"۔

"میرے لیے کیا حکم ہے جی؟" مولو نے اشرف خاں سے پوچھا۔

"تو آدمی لے کر جا اور حیاتے کی لاش لا کر دفن کر لیکن پہلے حویلی چل اور وہاں بیٹھ کر کچھ کھا پی لے"۔

"آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے راوی پار؟"

"جاؤں گا، ضرور جاؤں گا لیکن میں واپس نہیں آؤں گا وہیں رہوں گا اور جنگلی ریچھ کا شکار کروں گا"۔

اشرف خاں پلٹ کا زمین دار تھا۔ پلٹ اس گاؤں کا نام تھا جو دریائے راوی کے پار رہنے والے زمین داروں نے سرکاری زمین پر بسایا تھا۔ 1947ء میں جب پاکستان قائم ہوا تو برطانوی جج ریڈکلف نے بے انصافی کی اور ضلع گورداس پور کی تحصیلیں گورداس پور، پٹھان کوٹ اور بٹالہ انڈیا کو دے دیں اور اس ضلع کی صرف ایک تحصیل شکر گڑھ پاکستان میں شامل کی۔ حال آں کہ گورداس پور کے ضلع میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ شکر گڑھ کی تحصیل میں انڈیا کے ساتھ جو سرحد طے ہوئی وہ دریائے راوی کے آر پار تھی۔ پھر یوں ہوا کہ دریائے راوی میں سیلاب آتے رہے اور دریا اپنا رخ بدلتا رہا۔ بہت سے پاکستانی دیہات سیلاب کی زد میں آئے اور ان دیہات کے لوگوں کو نقل مکانی

کرنا پڑی۔ 1965ء اور 1971 کی پاک بھارت لڑائیوں کی وجہ سے بھی سرحدی دیہات کے لوگ اپنے گاؤں چھوڑ کر نئے دیہات بسانے پر مجبور ہوئے۔ ان میں سے پلٹ ایک نیا بسایا ہوا گاؤں تھا جہاں اشرف خاں، مولو، حیاتا اور دوسرے لوگ رہتے تھے لیکن ان کی زرعی اراضی راوی کے پار تھی۔ یہ اراضی جنگل اور بیلے کی صورت اختیار کر چکی تھی لیکن اب لوگوں نے محنت کر کے اسے ٹریکٹروں کے ذریعے آباد کر لیا تھا۔ وہاں خوب فصلیں اگتی تھیں۔ دریائے راوی کے اس پار صرف کاشت کار، کسان اور کھیت مزدور حسب ضرورت کام کرتے تھے اور ان کے بال بچے نئے بسائے گئے دیہات میں رہتے تھے، یہی وجہ تھی کہ راوی پار آبادی زیادہ نہ تھی اور کھیتوں میں کام کرنے والے جھونپڑیوں، کٹیاؤں اور کوٹھوں میں رہتے تھے، جیسے حیاتا چنگڑ اور مولو۔ اشرف خاں نگرانی کے لیے کبھی کبھار راوی پار جاتا تھا۔

راوی پار جانے کے لیے پل تو تھا نہیں اس لیے کشتی سے کام لیا جاتا تھا جسے مقامی طور پر بیڑی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بیڑی بہت بڑی تھی اور لوگ اسے بیڑا کہتے تھے۔ ٹریکٹروں کو بھی اسی پر لاد کر دریا پار کیا جاتا تھا۔ اشرف خاں کا ٹریکٹر بھی اسی بیڑے کے ذریعے پار اتارا گیا تھا۔ فصل کاٹنے کے لیے تھریشر بھی اسی بیڑے سے پار جاتے تھے اور گندم اور دھان کی فصل کاٹ کر واپس آتے تھے۔ یہ تھریشر کرایہ پر ملتے تھے اور فی ایکڑ فصل کٹائی ایک ہزار روپے تھی۔

اشرف خاں ایک چارپائی بھی ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اس نے بیڑے میں رکھی اور اس پر بیٹھ کر بدقسمت حیاتے کی افسوس ناک موت پر غور کرنے لگا۔ یہ اکتوبر کا مہینا تھا۔ اس موسم میں دریائے راوی میں پانی زیادہ نہیں ہوتا۔ دریا پرسکون ہوتا ہے اور اپنے کناروں کے اندر بہتا ہے۔ سال کا یہ وہ حصہ ہے جب دریا میں مچھلی عام ہوتی ہے اور مچھیرے اسے پکڑ کر منڈی لے جاتے ہیں۔ آج بھی مچھیرے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ عام دنوں میں یہ منظر اشرف خاں کے لیے خوش کن ہوتا تھا لیکن آج نہیں۔ آج اس کا دل حیاتے کی موت سے دولخت ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں کے کونے بھیگ چکے تھے۔

"جی، آپ اکیلے کھیت میں رہیں گے؟" مولو نے پوچھا جو کھیت مزدور تھا۔

"نہیں، تو میرے ساتھ ہوگا۔ باقی آدمی حیاتے کی میت لے کر گاؤں چلے جائیں گے اور اسے گاؤں کے قبرستان میں دفن کر دیں گے"۔

"کیا آپ کا ہونا ضروری نہیں؟"

"ضروری تو ہے لیکن اس سے کہیں ضروری یہ ہے کہ جس نے حیاتے کو مارا ہے اس کو مارا جائے"۔

"ہاں، یہ بات تو ہے۔ جنگلی ریچھ کا مارنا بہت ضروری ہے۔ اگر اسے نہ مارا گیا تو وہ اور نقصان کرے گا"۔

بگلے دریا پر اڑ رہے تھے اور غوطہ لگا کر مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دریا کا دوسرا کنارا آیا تو اشرف خاں سمیت سبھی بیڑے سے اتر گئے۔ وہ سب کھیتوں کی طرف چل دیئے جو بیلے سے کچھ فاصلے پر بیلا صاف کر کے فصلوں کے لیے تیار کئے گئے تھے اور جن میں تل اور دھان کی فصلیں تھیں۔

جب وہ جھونپڑی کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہاں حیاتے کی لاش نہیں ہے۔ وہ اسے تلوں کے کھیت میں تلاش کرنے لگے اور آخر وہ کچھ فاصلے پر مل گئی لیکن یہ لاش نہیں تھی صرف ہڈیاں تھیں جو چھوڑی ہوئی تھیں۔ جنگلی جانور لاش کو گھسیٹ کر لے گئے تھے اور انہوں نے اس کا سارا گوشت چٹ کر لیا تھا۔ آخر اشرف خاں نے ہڈیوں کو کھیس میں لپیٹا اور اپنے ساتھیوں کو گاؤں روانہ کیا، مولو اشرف خاں کے ساتھ کوٹھڑی میں ہی رہا کیوں کہ اس نے کھانا پکانا تھا اور پھر رات کو پہرہ بھی دینا تھا۔

اشرف خاں اور مولو دو سو ایکڑ کھیت کے کناروں پر گھومتے رہے۔ ان کے پاس اپنی حفاظت کے لیے لاٹھیاں اور خنجر تھے۔ بندوق سے گولی چلانے کی اجازت نہ تھی۔ ہاں، اگر گولی چلانے کی ضرورت ہو تو وہ رینجر کو درخواست کر سکتے تھے۔ لیکن رینجر کو اطلاع کرنا آسان نہ تھا۔ کافی فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ تاہم رینجر گشت پر رہتے تھے لیکن دن کے وقت،

رات کو تو کسانوں کو اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت پہرہ خود دینا پڑتا تھا۔ گھومنے پھرنے کے بعد وہ دونوں جھونپڑی میں آئے۔ وہ کافی دیر تک گھومتے رہے تھے اور اب جب جھونپڑی میں آئے تو سورج مغرب میں ڈوب رہا تھا۔ سرخ کرنیں دریائے راوی کی پرسکون سطح پر بکھر رہی تھیں۔ ملاح اور اس کا بیڑا' مچھیرے اور ان کے جال' غوطہ خور بگلے اور ماہی خور پرندے کہیں نظر نہ آتے تھے۔ ان کی جگہ ننھی منی اور پھرتیلی ابابیلوں نے لے لی تھی۔ اکا دکا درختوں پر کوے فاختائیں اور چڑیاں بیٹھ کر رات بسر کرنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ خرگوش' لومڑیاں' جنگلی سور' گیدڑ' لگڑ بگڑ اور ریچھ رات کا انتظار کر رہے تھے۔

مولو نے کھانا تیار کیا اور دونوں نے خاموشی سے کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد اشرف خاں نے پوچھا۔

"کیا خیال ہے مولو' ریچھ حملہ آور ہو گا یا نہیں؟"

"آج چاند کی چودہ تاریخ ہے۔ کہتے ہیں چاند کی کرنوں کا اثر جنگلی جانوروں پر بھی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے ریچھ جھونپڑی کا چکر ضرور لگائے گا"۔

"تو پھر اس کے مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ"۔

"میں جنگلی جانوروں کا لاٹھی یا خنجر سے مقابلہ نہیں کر سکتا' مجھے ڈر آتا ہے"۔

"یہ مقابلہ تو آپ کو کرنا پڑے گا"۔

"اگر ایک سے زیادہ جنگلی ریچھ آگئے تو پھر؟"

"پھر کیا' مقابلہ پھر بھی ہو گا۔ لیکن جیت کس کی ہو گی یہ پتا نہیں"۔

اشرف خاں کی عمر 40 برس تھی۔ قد درمیانہ تھا لیکن سڈول اور مضبوط تھا۔ جوانی میں وہ کبڈی کا کھلاڑی تھا اور اپنے گاؤں کی کبڈی ٹیم کا کپتان بھی۔ اس نے جھونپڑی سے باہر نکل کر دیکھا۔

بجلی کے بلب جل رہے تھے اور ان کی دھیمی دھیمی روشنی کوٹھڑی تک آ رہی تھی۔ تلوں اور دھان کی فصلیں چودھویں کے چاند اور بجلی کی روشنی میں نہا رہی تھیں۔ اشرف خاں نے کوٹھڑی کے اندر دیکھا' مٹی کے تیل سے جلنے والی لالٹین اپنی ہستی کے مطابق روشنی بکھیر رہی تھی۔

"خان صاحب! آپ نے آواز سنی؟" مولو نے پوچھا۔

"کس چیز کی آواز؟" اشرف خاں نے پوچھا۔

"ریچھ کی' جنگلی ریچھ کی' کل اسی وقت اس نے حملہ کیا تھا"۔

"ہاں' آواز تو آ رہی ہے۔ لیکن یہ ریچھ کی ہے یا سور کی؟"

"یہ ریچھ کی آواز ہے۔ سور کی نہیں' سور کی آواز کھر کھر اور گھر گھر ہوتی ہے۔ یہ ریچھ کی آواز ہے جس میں کھر کھر اور گھر گھر نہیں"۔

"تو مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ اگر یہ ریچھ کی آواز ہے تو تیار ہو جاؤ اسے مارنے کے لیے"۔

وہ دونوں لٹھ اور خنجر لے کر چپکے سے کوٹھڑی میں بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے۔ انتظار کرتے ہوئے رات کے 9 بج گئے۔ اب ہر طرف خاموشی تھی اور اس خاموشی کو جنگلی جانوروں کی آوازیں چیر رہی تھیں۔ نمایاں آوازیں گیدڑوں اور جنگلی کتوں کی تھیں۔ بھیڑیے بھی پیچھے نہ تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی طرف دو کالی چٹانیں لڑھکتی چلی آئیں۔ ایک نہیں دو جنگلی ریچھ ان پر حملہ آور ہو رہے تھے۔

اشرف خاں نے آگے بڑھ کر پہلے ریچھ پر لاٹھی سے حملہ کیا۔ اس کے بعد مولو نے ریچھ کے سر پر لاٹھی ماری۔ بہ یک وقت دو لاٹھیوں کی مار کھا کر پہلا ریچھ پلٹا اور تل کی فصل میں گم ہو گیا۔ "تو اس کا پیچھا کر" اشرف خاں نے کہا اور دوسرے ریچھ کے سامنے آ کر لاٹھی اس کی تھوتھنی پر ماری۔ ریچھ درد سے بل بلا اٹھا اور چنگھاڑ کر اشرف خاں پر حملہ آور ہوا۔ وہ چھلانگ لگا کر اشرف خاں پر لپکا تھا۔

دو من وزنی ریچھ کی جست اشرف خاں برداشت نہ کر سکا اور زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ پھر ریچھ نے گرے ہوئے اشرف خاں کے کندھے پر پنجہ مارا اور اس کے کندھے سے خون کی دھار بہ نکلی۔ درد سے اس کی چیخ نکل گئی لیکن

مقابلے کے سوا چارا نہ تھا۔ وہ گھٹنوں پر زور دے کر اٹھا اور بجلی کی تیزی سے اس نے پہلو سے خنجر نکالا۔ اب لاٹھی کام نہ دے سکتی تھی۔ خنجر ہاتھ میں پکڑے اشرف خاں ریچھ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ریچھ بھی اپنے پچھلے پیروں پر حملہ کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس کے لمبے لمبے دانت چاندنی اور بجلی کی روشنی میں استروں کی طرح چمک رہے تھے۔

ریچھ نے چھلانگ لگا کر اشروف کی شہ رگ پر اپنے دونوں پنجے جما دیئے۔ اشرف خاں نے خنجر سے اس کے لمبوترے منہ کے نیچے وار کیا' ریچھ کے پنجے اشرف خاں کی شہ رگ میں دھنس نہ پائے تھے اس لیے ریچھ کو شہ رگ چھوڑنا پڑی۔ خنجر کے وار سے ریچھ زیادہ غصے میں آگیا اور اس نے اشرف خاں کے بائیں بازو کو' کلائی سے اوپر' دانتوں میں جکڑ لیا۔ قریب تھا کہ بازو ٹوٹ جاتا' اشرف خاں نے جھک کر خنجر ریچھ کے پیٹ میں بھونک دیا۔ ریچھ درد سے بلبلا اٹھا۔ وہ چیخا چنگھاڑا اور اپنے دونوں پنجوں سے اشرف خاں کے کندھوں اور کمر کو ادھیڑنے لگا۔ اب اشرف خان کا بچنا محال تھا لیکن اس نے ہمت اور دلیری سے کام لیا اور خنجر کے پے در پے وار کر کے ریچھ کی انتڑیاں زمین پر ڈھیر کر دیں۔ جھونپڑی کے سامنے اگی ہوئی گھاس میں جہاں زندگی اور موت کی لڑائی جاری تھی' ریچھ کے پیر جم نہ سکے اور وہ لڑھک کر گر پڑا۔ اشرف خاں نے نیچے سے نکل کر ریچھ کی شہ رگ کو چیر ڈالا۔ ریچھ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گا۔

تھوڑی دیر بعد مولو آیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"خاں صاحب' خاں صاحب' کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے ریچھ مر گیا ہے اور میں مر رہا ہوں۔ جلدی سے دیسی تیل میں ہلدی ڈال کر میرے زخموں پر مرہم پٹی کی طرح باندھو' میری ململ کی پگڑی کاٹ کر اس کی پٹیاں بنا لو۔ لیکن پہلے دیسی گھی میں شکر ڈال کر دو' میں گھی پی لوں تاکہ جسم میں طاقت آئے۔ اگر گھی گرم کرنا پڑے تو کر لو"۔



مولو نے چارپائی پر بستر بچھایا اور اشرف خان کو اس پر لٹا دیا۔

"تیرے ریچھ کا کیا بنا؟" اشرف خان نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

"وہ پاک انڈین بارڈر کی طرف بھاگ گیا پھر مجھے نظر نہیں آیا"۔ مولو نے بتایا۔

"چلو اچھا ہوا' اس سے کل مقابلہ ہو گا"۔ اشرف خاں نے کہا اور درد سے کراہنے لگا۔

ورلڈ وائلڈ لائف

ڈاکٹر رضوان ثاقب

ریچھ



سطحِ زمین پر رہنے والے درندوں میں ریچھ سب سے بڑے اور بھاری جسم کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کا سر چوڑا اور بڑا' آنکھیں چھوٹی اور دم اتنی چھوٹی کہ بالوں میں چھپی ہوتی ہے۔ کان گول اور چھوٹے، ٹانگیں مضبوط اور سارے پاؤں میں پانچ پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہر انگلی پر تیز اور مڑے ہوئے چنگل ہوتے ہیں جو مستقلاً باہر نکلے رہتے ہیں۔ چلتے وقت ان کے پاؤں کے تلوے پوری طرح زمین کو چھوتے ہیں۔ مضبوط چنگلوں سے ریچھ چیرنے پھاڑنے اور زمین کھودنے کا کام لیتے ہیں۔ بال لمبے، موٹے اور گچھے دار ہوتے ہیں اور ان کا رنگ یکساں طور پر ہوتا ہے۔ ہونٹ مسوڑھوں سے آزاد ہو کر آگے کی طرف تھوتھنی سی بناتے ہیں۔ ڈاڑھ کے دانت اوپر سے چپٹے ہوتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہر قسم کی خوراک کھا لیتے ہیں۔ ان میں دیکھنے اور سننے کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔

ریچھوں میں دور دراز تک سفر کرنے کی عادت ہوتی ہے اس لیے موقع کے لحاظ سے پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہو کر چل لیتے ہیں۔ ریچھوں میں سننے اور دیکھنے کی حسیں کم زور ہونے کی باعث وہ چستی موجود نہیں ہوتی جو دوسرے درندوں کی خاص علامت ہے۔ اسی وجہ سے ریچھ کی اکثر حرکات کے اندر گھبراہٹ کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ ایسے میں وہ چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ البتہ سرکسوں اور چڑیا گھروں میں سدھائے ہوئے ریچھ کافی ذہانت کے کرتب دکھاتے ہیں۔

پاکستان میں دو قسم کے ریچھ پائے جاتے ہیں۔ ایک سرخ یا بھورا ریچھ، اسے برفانی ریچھ (Snow Bear) بھی کہا جاتا ہے جب کہ دوسری قسم کالے یا سیاہ ریچھ کی ہے۔

(1) بھورا ریچھ:-

بھورے ریچھ کا رنگ مدھم بھورا ہوتا ہے اور جسم عام طور پر سیاہ ریچھ سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ کشمیر اور پاکستان کے

شمالی علاقوں میں ملنے والے نر بھورے ریچھ عام طور پر 5 سے 7 فٹ تک لمبے ہوتے ہیں۔ بالغ بھورے ریچھ کا وزن ڈیڑھ سو کلو گرام سے اڑھائی سو کلوگرام تک ہوتا ہے۔

بھورا ریچھ دنیا کے کئی ممالک میں پایا جاتا ہے لیکن کہیں بھی انسانوں کے لیے اسے خطرناک نہیں سمجھا جاتا۔ جنگل میں آدمی کو دیکھ کر یہ عموماً وہاں سے ہٹ کر چلتا ہے۔ البتہ اگر کوئی انسان جنگل میں گھومتے ہوئے کسی ریچھ کے سر پر اس کی بے خبری میں جا پہنچے تو ریچھ اپنے پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو کر اگلے پاؤں ہوا میں لہراتا ہے اور غراتے ہوئے دخل اندازی کرنے والے کو خوف زدہ کر دیتا ہے۔ اس کا یہ غصہ محض دکھاوے کا نہیں ہوتا۔ اگر انسان فوراً وہاں سے نہ ہٹ جائے تو ریچھ باقاعدہ حملہ آور ہو جاتا ہے اور اگلے پاؤں کی ایک ہی ضرب سے آدمی کو گرا دیتا ہے۔ اگر کسی شکاری کی گولی اسے ہلاک نہ کر سکے تو تب بھی یہ فوراً حملہ کر دیتا ہے اور اس کا نتیجہ عام طور پر شکاری کی ہلاکت ہی ہوتا ہے۔ بہرحال عام طور پر صرف زخمی اور گھیرے میں آئے ہوئے بھورے ریچھ ہی آدمی کے لیے خطرناک ہوتے ہیں۔

بھورے ریچھ کی خوراک میں تمام قسم کے پودے، کیڑے مکوڑے، گھونگے، چوہے اور موش وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ وہ مردہ جانوروں کا گوشت بھی کھا جاتا ہیں۔ یہ اپنی رہائش گاہوں میں پتھروں کو الٹ پلٹ کر ان کے نیچے چھپے ہوئے کیڑوں مکوڑوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں۔ کئی آبی اور دوسرے پودوں کی کلیوں کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ زیرزمین رہنے والے وول چوہوں (Voles) کو بھی کھود نکالتے ہیں۔ بعض اوقات انہیں چراگاہوں میں چرنے چگنے والے چوپایوں کو شکار کرنے کی بھی عادت پڑ جاتی ہے۔

بالغ بھورے ریچھ اپنے بھاری وزن کے باعث خود درخت پر چڑھنے کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ بہرحال جب بچوں کو خطرہ درپیش ہو مثلاً بھیڑیے یا جنگلی کتے یا انسان کے قریب ہونے کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کے لیے خطرہ محسوس کریں تو مادہ ریچھ بچوں کو زبردستی بڑے سخت رویہ کے ذریعے اور غراتی ہوئی درختوں پر چڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ بچوں کو کاٹتی اور مارتی بھی ہے تاکہ وہ فوراً درخت پر چڑھ جائیں۔ حتیٰ کہ درخت کے تنے پر اس وقت تک ان کو رکنے نہیں دیتی جب تک وہ اونچی شاخوں پر نہ پہنچ جائیں۔ بھورے ریچھ کے بچے ابتدا میں درخت پر چڑھنے میں کافی دقت محسوس کرتے ہیں لیکن جلد ہی وہ چڑھنا سیکھ جاتے ہیں۔

بھورے ریچھ موسم خزاں میں معمول سے زیادہ موٹے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت یہ سردی کا موسم گزارنے کے لیے کسی غار یا کھوہ کو تلاش کرتے ہے۔ وہ ایسی جگہوں کو بھی پسند کر لیتے ہیں جو چٹانوں کے درمیان لیکن محفوظ ہوں۔ یہ ایسی جگہوں پر درختوں کی شاخوں اور پتوں کا آرام دہ بستر تیار کرتے ہیں اور پھر وہ اس میں لیٹ کر یا گول مول ہو کر کئی ماہ تک پڑے رہتے ہیں۔ موسم سرما کے آخر میں ان کے ہاں دو یا تین بچے پیدا ہوتے ہیں۔ نوزائیدہ بچے اندھے اور ان میں سے ہر ایک کا وزن آدھا کلوگرام ہوتا ہے۔ ان کا سائز ایک چوہے کے برابر ہوتا ہے۔ مادہ ان کی نگہداشت بہت محنت سے کرتی ہے۔ بچے سال بھر ماں کے ساتھ رہتے ہیں۔ بھورے ریچھ کی عمر 15 سے 34 سال تک ہوتی ہے۔ ایک پالتو بھورا ریچھ 47 سال تک بھی زندہ رہا۔

بھورا ریچھ پاکستان میں بہت کم تعداد میں ملتا ہے۔ شمالی چترال میں ترکھو، یرکون کی وادیوں میں، سوات، کوہستان، گلگت اور بلتستان میں ملتا ہے۔ یہ کم بلندیوں پر صرف درختوں کے پتے کھانے آتا ہے۔ چوں کہ ان علاقوں میں بارش کم ہوتی ہے اس لیے سبزہ بھی کم ہوتا ہے اس لیے سبزہ غیر یقینی ہونے کے باعث یہاں ان کی تعداد محدود رہتی ہے۔

(2) سیاہ ریچھ:-

کالے ریچھ یا سیاہ ریچھ کو ایشیائی سیاہ ریچھ یا ہمالیائی سیاہ ریچھ بھی کہتے ہیں۔ یہ ایران سے مشرق اور شمال کی طرف کوہ

ہمالیہ کے سلسلوں میں سے ہوتا ہوا چین، سائبیریا، کوریا اور شمالی جاپان تک کے ممالک میں پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں کالے ریچھ کی مندرجہ ذیل دو ذیلی انواع پائی جاتی ہیں۔ 1- ہمالیائی سیاہ ریچھ۔ 2۔ بلوچستانی سیاہ ریچھ۔

ہمالیائی سیاہ ریچھ صوبہ سرحد اور کشمیر میں وادی کاغان، سوات، دیر کے جنگلات کے علاقوں شوگران، مانکیال، کالام، جبہ اور شیر گڑھ اور آزاد کشمیر میں مظفر آباد اور نیلم وادی میں ملتا ہے۔ کاغان سے آگے گلگت، چلاس اور ملحقہ علاقے استور میں بھی پایا جاتا ہے۔ نصف صدی قبل یہ مری (پنجاب) کے آس پاس بھی ملتا تھا اور کوہستان (سوات) میں بھی ہوتا تھا۔

بلوچستانی سیاہ ریچھ ژوب، شنگر، تخت سلیمان، خضدار، ضلع مکران اور خاران میں ملتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے اکا دکا افراد کیر تھر کی پہاڑیوں میں بھی نظر آجاتے ہیں لیکن باقاعدہ اور مسلسل یہ سیاہ ریچھ وہاں نہیں ملتا۔

کالا یا سیاہ ریچھ، بھورے ریچھ کے مقابلے میں زیادہ خوب صورت درندہ ہے۔ اس کے سیاہ رنگ میں کسی قدر بنفشی رنگ جھلکتا ہے۔ سر اور دھڑ کی لمبائی 1.3 میٹر سے لے کر 1.6 میٹر تک اور دم کی لمبائی 76 سے 106 ملی میٹر تک ہوتی ہے۔ وزن عام طور پر 120 کلو گرام تک ہوتا ہے۔ ٹھوڑی کے نیچے کچھ سفیدی ہوتی ہے اور چھاتی پر انگریزی حرف وی (V) شکل کے سفید بالوں کا ایک نشان ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس جنس کا نام سیلینارکٹوس (Selenarctos) ہے جس کا لفظی مطلب "چاند ریچھ" ہے۔ ان کے بال کم لمبے ہوتے ہیں لیکن گردن کے دونوں طرف لمبے بالوں کی جھالریں لٹکی ہوتی ہیں۔ کان بڑے اور گول ہوتے ہیں۔

سیاہ ریچھ کی سننے کی حس بھورے ریچھ کے مقابلے میں بہتر ہوتی ہے۔ اس لیے یہ جنگل میں خطرے کو دور سے بھانپ لیتا ہے۔ بنیادی طور پر سیاہ ریچھ جنگلات میں رہتا ہے۔ زیادہ تر چوڑے پتے والے درختوں اور چیڑ کے جنگلات میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اس کے برعکس بلوچستانی سیاہ ریچھ جھاڑی دار پہاڑی وادیوں میں بھی رہ لیتا ہے۔ ہمالیائی سیاہ ریچھ عام طور پر 3600 میٹر تک بلندی پر موسم گرما گزارتا ہے۔ موسم سرما میں 1500 میٹر بلندی تک نیچے آجاتا ہے۔ موسم سرما میں برف پر درختوں کی شاخیں بچھا کر اپنا بستر بناتا ہے۔ جہاں یہ نمی سے محفوظ رہنے کے لیے بیٹھتا ہے۔ موسم گرما میں اپنا گھونسلا درختوں کی شاخوں پر بناتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے ننگے تلووں کی بدولت آسانی سے درختوں پر چڑھ جاتا ہے۔ اگرچہ دیکھنے میں ڈھیلا ڈھالا لگتا ہے لیکن حملہ کرتے وقت یا اپنا دفاع کرتے وقت اس میں بلا کی پھرتی آجاتی ہے۔ یہ اپنے تیز اگلے چنگلوں کی وجہ سے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ دوسری انواع کے ریچھوں کے مقابلے میں سیاہ ریچھ زیادہ تند و تیز مزاج کے مالک ہوتے ہیں۔

سیاہ ریچھ اپنی خوراک کے لیے پودوں کے پتوں اور پھلوں پر زیادہ انحصار کرتا ہے۔ اس کے لیے پھرتی سے درختوں پر چڑھ جاتا ہے لہٰذا پھل کے موسم میں ایک درخت پر دو دو، تین تین سیاہ ریچھ بھی چڑھے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ زیادہ تر یہ شاہ بلوط کے پکے ہوئے پھل، شہتوت، خوبانیاں اور بھٹے کھانے کے شوقین ہوتے ہیں۔ یہ مکئی کے کھیتوں پر حملہ آور ہو کر کافی نقصان پہنچاتے ہیں۔ شہد حاصل کرنے کی خاطر درختوں کی چوٹیوں تک چڑھ جاتے ہیں۔ یہ سوات کے کوہستانی علاقے میں کھمبیاں بھی کھاتے ہوئے دیکھے گئے۔ بلوچستانی سیاہ ریچھ بیری اور زیتون کے پھل اور کھجور کے درختوں کی جڑیں بھی کھاتے ہیں۔ ضرورت اور عادت کے مطابق سیاہ ریچھ دیمک حشرے، ٹڈیاں اور چھپکلیاں بھی کھاتے ہیں۔ بعض سیاہ ریچھ دیہات کے قریب پالتو بکریوں، بھیڑوں، گائے، بھینسوں، گدھوں اور گھوڑوں کو بھی ہلاک کر کے کھا جاتے ہیں۔ گاہے گاہے انسانوں کی ہلاکت کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔

سیاہ ریچھ خاموش طبع جانور ہے لیکن اگر اسے پریشان کیا جائے تو حملہ کر دیتا ہے۔ سرکسوں میں سدھائے ہوئے ریچھوں پر اسی لیے کڑی نظر رکھنی چاہئے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے دیہات میں بعض اوقات ریچھ کو تین چار کتوں سے لڑایا جاتا ہے جو اس پر ظلم سے کم نہیں۔

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

NO. CPL. 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00



Ch. Amanat Ali & Sons
Rahim Yar Khan
Phone : 72626

JANUARY

S	M	T	W	T	F	S
	1	2	3	4	5	6
7	8	9	10	11	12	13
14	15	16	17	18	19	20
21	22	23	24	25	26	27
28	29	30	31			

FEBRUARY

S	M	T	W	T	F	S
				1	2	3
4	5	6	7	8	9	10
11	12	13	14	15	16	17
18	19	20	21	22	23	24
25	26	27	28			

MARCH

S	M	T	W	T	F	S
				1	2	3
4	5	6	7	8	9	10
11	12	13	14	15	16	17
18	19	20	21	22	23	24
25	26	27	28	29	30	31

APRIL

S	M	T	W	T	F	S
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30					

MAY

S	M	T	W	T	F	S
		1	2	3	4	5
6	7	8	9	10	11	12
13	14	15	16	17	18	19
20	21	22	23	24	25	26
27	28	29	30	31		

JUNE

S	M	T	W	T	F	S
					1	2
3	4	5	6	7	8	9
10	11	12	13	14	15	16
17	18	19	20	21	22	23
24	25	26	27	28	29	30

JULY

S	M	T	W	T	F	S
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30	31				

AUGUST

S	M	T	W	T	F	S
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30	31	

SEPTEMBER

S	M	T	W	T	F	S
30						1
2	3	4	5	6	7	8
9	10	11	12	13	14	15
16	17	18	19	20	21	22
23	24	25	26	27	28	29

OCTOBER

S	M	T	W	T	F	S
	1	2	3	4	5	6
7	8	9	10	11	12	13
14	15	16	17	18	19	20
21	22	23	24	25	26	27
28	29	30	31			

NOVEMBER

S	M	T	W	T	F	S
				1	2	3
4	5	6	7	8	9	10
11	12	13	14	15	16	17
18	19	20	21	22	23	24
25	26	27	28	29	30	

DECEMBER

S	M	T	W	T	F	S
30	31					1
2	3	4	5	6	7	8
9	10	11	12	13	14	15
16	17	18	19	20	21	22
23	24	25	26	27	28	29

فیروزسنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور راولپنڈی کراچی